خیابان
اسلام اور اردو
جشن سیمیں
شعبہ اردو
پشاور یونیورسٹی

جشنِ سیمیں نمبر

ترتیب

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری

شمارہ ——— ۱۱

جون ——— ۱۹۸۲

شعبہ اردو ——— پشاور یونیورسٹی

کتابت ——— عبدالنعیم قریشی

حمیدیہ برقی پریس پشاور

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی کے مجلے "خیابان" کا گیارہواں شمارہ آپ کے پیش نظر ہے۔ یہ شمارہ دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں شعبہ اردو کے جشن سیمیں کی روداد خطبہ استقبالیہ اور شعبے کی پچیس سالہ کارکردگی کا مختصر سا جائزہ شامل ہے۔ اور دوسرے حصے میں "اردو اور اسلام" کے وسیع موضوع پر مختلف مقالات و مضامین شامل ہیں۔ شعبے کے جشن سیمیں کے موقع پر جو اکتوبر ۱۹۸۱ء میں منعقد ہوا "اردو اور اسلام" کے موضوع پر ایک مذاکرہ دو نشستوں میں منعقد ہوا تھا۔ اس مذاکرے میں جو مقالات پڑھے گئے اور زیر بحث آئے وہ سب اس شمارے کے دوسرے حصے میں شامل ہیں۔ ہم شرکائے مذاکرہ کے بے حد شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات سے وقت نکال کر ہماری دعوت کو شرف قبولیت بخشا اور ہمارے ساتھ جشن سیمیں میں شامل ہو کر ہماری مسرتوں میں اضافے کا موجب بنے۔ شرکائے مذاکرہ کے علاوہ ہماری درخواست پر ملک کے کئی فاضل اہل قلم نے جو اپنی مصروفیات کے باعث مذاکرے میں شریک نہ ہو سکے "اردو اور اسلام" کے دائرے میں رہتے ہوئے مختلف اور متنوع موضوعات پر اپنی نگارشات ہمیں روانہ کیں اس کے لئے ہم ان کے تہ دل سے شکر گزار ہیں۔

جیسا کہ قارئین خود ملاحظہ فرمائیں گے ہم نے کوشش کی ہے کہ موضوع کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑ سکے۔ نظری و اصولی بحثیں بھی ہیں، عملی اور اطلاقی تنقیدیں اور جائزے بھی۔ اردو کے ادبی، تاریخی، علمی اور دینی کردار پر بھی توجہ دی گئی ہے اور ان اصناف پر بھی جنہیں ہم اسلامی اصناف ادب قرار دے سکتے ہیں۔ بعض جدید اصطلاحوں اور تحریکوں پر مقالات بھی اس حصے میں شامل ہیں "اردو اور اسلام" کا موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس کے ہر پہلو کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ تاہم کوشش کی گئی ہے کہ کوئی اہم پہلو نظر انداز نہ ہو جائے۔ مذاکرے کے لئے یہ موضوع ہم نے پندرہویں صدی ہجری کے آغاز کی مناسبت سے منتخب کیا تھا اور ہمیں بڑی خوشی ہے کہ اس موضوع کو شرکائے مذاکرہ اور دوسرے اہل قلم نے بہت پسند کیا۔ اقبال، غالب، بشرو، انیس، دانائے راز۔ طاہر فاروقی اور پاکستانی زبان و ادب سے متعلق خصوصی شماروں کے بعد خیابان کا "اردو اور اسلام" نمبر شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی کے جشن سیمیں اور پندرہویں صدی ہجری کے آغاز کے موقع پر شعبہ کے اساتذہ اور طالب علموں کی طرف سے اردو کی علمی و ادبی دنیا کے لئے ایک حقیر سا تحفہ ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی
ڈاکٹر سید مرتضیٰ اختر جعفری

شعبہ اردو
یکم جون ۱۹۸۲ء

یہ بڑی خوشی آئند بات ہے کہ شعبہ اردو نے زندگی کے پچیس برس پورے ہونے پر جشن سیمیں کی تقریب منعقد کی تھی اور اس میں اسلام اور اردو کے موضوع پر مجلس مذاکرہ کا اہتمام کیا تھا اب اس موقعے پر لکھے گئے تمام مقالات کو شعبے کے مجلہ "خیابان" میں یکجا کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔

اردو زبان کی عمر کو زیادہ نہیں لیکن اس زبان کی کم عمری کے باوجود مختلف اصناف ادب میں جو شہپارے تخلیق ہوتے ان سے اس زبان کی وسعت بلندی اور گہرائی کا احساس ہوتا ہے۔

اردو نے شاعری میں فارسی زبان کا تتبع کیا لیکن آج اردو زبان کی شاعری دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری کے ہم پلہ ہے اردو نے نثر میں ترقی کی جو منزلیں طے کی ہیں وہ نہ صرف قدیم اصناف ادب کے مطالعے سے سامنے آتی ہیں بلکہ نئی اصناف ادب میں مہتمم بالشان تصنیفات کی صورت میں اس زبان کی ہمہ گیری کو ثابت کرتی ہیں۔

اردو زبان کا اسلام اور اسلامی ادب سے بھی گہرا تعلق رہا ہے اس زبان کی سرپرستی دکن اور شمالی برصغیر میں مسلمانوں نے ہر دور میں کی پھر پاکستانی دور میں اردو کی ملک گیر مقبولیت اور تفہیم نے لکھنے والوں کو حوصلہ بخشا کہ اسلام کی شاندار روایات کے ساتھ ساتھ معقولات اور منقولات میں اپنے علم و دانش کے جوہر دکھائیں جن میں ترجمہ و تفسیر، تاریخ و سیر، داستان و افسانہ، تنقید و تحقیق، نظم میں حمد و ثنا، نعت و منقبت اور مرثیہ و رباعی میں اسلامی تصورات و تعلیمات کو ہر دور میں تخلیقی حسن کے ساتھ پیش کیا گیا۔ شعبہ اردو کے جشن سیمیں کا یہ کارنامہ ہے کہ اردو زبان و ادب کے اس پہلو کو اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ اجاگر کر کے ایک تاریخی دستاویز بنا دیا ہے شعبہ اردو کی وساطت سے پشاور یونیورسٹی کے حصے میں ایک یادگار سنجیدہ اور بے حد اہم کارنامہ آیا ہے۔

مجھے اس خصوصی شمارے پر فخر ہے اور میں شعبہ اردو کے تمام اساتذہ کو ان کی اجتماعی اور کامیاب کوششوں پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تخلیق کی اس رفتار کو برقرار رکھیں گے اور آئندہ بھی ایسے ہی ٹھوس کاموں کی طرف توجہ دیتے رہیں گے۔

(ڈاکٹر رشید احمد خان طاہر خیلی)
وائس چانسلر
پشاور یونیورسٹی

ڈاکٹر سید عبداللہ ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی　　　　عبدالہاشم خان وزیر تعلیم صوبہ سرحد

پیغامات

مجھے یہ سن کر بے حد مسرت ہوئی کہ پشاور یونیورسٹی کا شعبہ اردو اپنی زندگی کے پچیس سال مکمل کر کے آج اپنا جشن سیمیں منا رہا ہے ۔ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ملک کے تعلیمی ادارے مملکت خداداد پاکستان کی ترقی میں اہم کردار ادا کرنے میں پیش پیش ہیں پشاور یونیورسٹی بھی ایک ایسا ادارہ ہے جس نے نہ صرف اس علاقے کی پسماندگی کو دور کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے بلکہ پاکستان کے اس بازوئے شمشیر زن کے رہنے والوں کو تعلیمی میدان میں ملک کے دوسرے حصوں کے دوش بدوش کھڑا کرنے میں بڑی جد و جہد کی ہے ۔

چونکہ اس یونیورسٹی سے میرا بہت قدیم سے تعلق رہا ہے اس وجہ سے میں ذاتی طور پر شعبہ اردو کی کارکردگی سے ، بے حد متاثر ہوں جس نے قومی زبان کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں ۔ اور تدریس کے سلسلے میں ایم ۔ اے ، ایم فل اور پی ۔ ایچ ڈی کے طلبہ کی رہنمائی کی ہے اس شعبہ کے اساتذہ طلباء و طالبات کو قابل مبارک باد سمجھتا ہوں اور شعبے کے جشن سیمیں کی اس پر مسرت تقریب میں خداوند عالم کے حضور دست بدعا ہو کہ اللہ تعالےٰ اپنے فضل و کرم سے اس شعبے کو دن دگنی رات چوگنی ترقی سے ہمکنار کرے ۔　　　(عبدالہاشم خان)

میرے لئے یہ امر انتہائی مسرت اور اطمینان کا موجب ہے کہ شعبہ اردو کے نام سے جو ننھا سا پودا آج سے پچیس برس پہلے پشاور یونیورسٹی میں لگایا گیا تھا وہ آج ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر چکا ہے ۔ اور اس کا گھنا سایہ دور دور تک پھیل رہا ہے ۔ جشن سیمیں پر میری دلی تہنیت قبول فرمایئے ۔

شعبہ اردو کے قیام کے وقت حالات انتہائی ناساعد تھے ۔ لیکن اس کے باوجود اہل سرحد کی اپنی قومی زبان سے محبت ، پشاور یونیورسٹی کے ارباب اختیار کی ہمدردی اور سرپرستی ، شعبے کے اساتذہ کی محنت اور شفقت اور سب سے بڑھ کر طلبہ کے ذوق و شوق نے اسے بہت جلد اچھی یونیورسٹی کا ایک ممتاز ادارہ بنا دیا ۔ اس ضمن میں شعبے کے پہلے تین سربراہوں ڈاکٹر مظہر علی خان مولانا عبدالقادر اور پروفیسر محمد طاہر فاروقی کی قابل قدر مساعی کو سب سے زیادہ دخل رہا ہے آج یہ تینوں اصحاب ہمارے درمیان موجود نہیں ۔ لیکن ان کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ باقی رہے گی اللہ تعالیٰ ان کے اعمال صالحہ کو قبول فرما کر انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے ان کے احسانات کے بدلے میں اب ہم اپنی طرف سے حرف دعائے مغفرت کا ہدیہ ہی پیش کر سکتے ہیں ۔

کسی تدریسی ادارے کی زندگی میں پچیس برس کا عرصہ کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ اداروں کی روایات تو کہیں صدیوں میں قائم ہوتی ہیں لیکن آپ کے شعبے نے اس قلیل عرصے میں جس تیزی سے اپنی ارتقا کے مراحل طے کئے ہیں انہیں کم سے کم الفاظ میں قابل رشک کہا جا سکتا ہے۔ آپ نے جو چراغ جلائے ہیں ان سے نہ صرف صوبہ سرحد کی ہر درسگاہ روشن ہے بلکہ ان کا نور ملک کی علمی انجمنوں اور ادبی محفلوں میں بھی پھیلا نظر آتا ہے۔ اپنی بین الجامعی اور کل پاکستان سطح کی علمی تقریبات اور اپنے موقر مجلے "خیابان" کے ذریعے آپ نے قومی زبان اور ادب کی خدمت میں ایک انفرادیت کا ثبوت بھی دیا ہے۔

میری دعا ہے کہ آپ کا شعبہ اسی طرح ترقی کرتا رہے اور جب اس کے جشن طلائی کا موقع آئے تو اردو زبان اور ادب کی ترویج کے سلسلے میں بھی ایسے کارنامے منظر عام پر آ چکے ہوں جو ملک کی دوسری جامعات کے لئے ایک مثال اور نمونے کا کام دے سکیں۔

انتہائی نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ

نیاز مند

سید عبداللہ

مسمی سلام مسنون! ۲۷ ستمبر ۱۹۸۱ء ۸۷/۸۸ لاین سمن آباد لاہور

مجھے یہ معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی کہ پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے اپنی زندگی کے ۲۵ سال پورے کر لئے ہیں اور اب آپ حضرات اساتذہ اور طلبا اکتوبر کے پہلے ہفتے میں اس کی سلور جوبلی منا رہے ہیں میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کیجیئے گذشتہ پچیس سال سے کسی نہ کسی صورت میں میرا تعلق شعبہ اردو سے رہا ہے میں اس شفقت اور محبت کو کبھی بھول نہیں سکتا جس کا اظہار آپ کے شعبے کے اساتذہ اردو کے طالب علموں کے ساتھ کرتے ہیں، پروفیسر طاہر فاروقی صاحب سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور آج تک جاری ہے اس کا یہ نتیجہ ہے کہ پشاور یونیورسٹی اور اس کے توسط سے دور افتادہ علاقوں میں بھی اردو زبان اور ادب کے مطالعے کا ماحول پیدا ہو گیا۔ میں اکثر ایم اے اردو کے امیدواروں کا زبانی امتحان لینے کیلئے آپ کے شعبے میں حاضر ہوا ہوں۔ اور میں ہمیشہ یہ دیکھ کر خوش ہوا ہوں کہ سوات، وزیرستان، مہمند ایجنسی، پاراچنار اور نہ جانے کہاں کہاں سے ایسے امیدوار آئے ہیں جنہوں نے اردو ادب کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے یہ بہت بڑی خدمت ہے جو آپ کے شعبے نے انجام دی ہے تحقیق کا کام بھی آپ کے شعبے میں خاصا ہوا ہے! اساتذہ نے اپنے اپنے میدانوں میں قابل قدر ادبی کارنامے انجام دیئے ہیں آپ کے رسالہ خیابان نے جو خاص نمبر اردو زبان اور اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر شائع کئے ہیں، وہ ہمیشہ ہمیشہ اہل علم کے لئے دلچسپی کا سامان فراہم کرتے رہیں گے۔ اس طرح دیکھا جائے تو آپ کے شعبے نے پاکستان اور اسلام کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں مجھے یقین ہے کہ شعبے میں آئندہ بھی اس قسم کے کاموں کا سلسلہ جاری رہے گا۔ خیر طلب:۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی لاہور

پروفیسر ظہور احمد اعوان

روداد

شعبۂ اردو پشاور یونیورسٹی کے جشنِ سیمیں کی روداد

پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے اپنی کارکردگی کے پچیس سال مکمل کر لیے۔ صدی کی اس چوتھائی کے حوالے سے شعبۂ اردو کے قدآوروں نے دو روزہ جشنِ سیمیں برپا کیا تھا۔ جشن کی تکمیل کا عزم تو تھا۔ شعبۂ اردو رنگ و آہنگ سے سج کر بزمِ نوبہار کی دھج دکھا رہا تھا۔ طلباء و طالبات زرق برق پیراہنوں میں ملبوس شاداں و خراماں مصروف و مستعد نظر آ رہے تھے دلوں کی جولانی۔ امنگوں کی تابانی۔ بشاشت کی فراوانی محبتوں کی ارزانی کا سامان بن رہی تھی۔ مسکراہٹوں کے پھول بات بات میں جھڑ رہے تھے۔ کدورتوں کی دھول معدوم ہو رہی تھی۔

یہ خطۂ ارض، جس کو صوبہ سرحد کہتے ہیں ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ اسلام کے شیدائیوں کا یہ مسکن ہمیشہ سے اپنے سینے کو فروغِ اسلام کے سپاہیوں اور علم کے فدائیوں کے لئے سرحدِ پاک پر سرفراز پہرہ دے رہا ہے۔ تاریخ کا قافلہ انہی پتھریلی راہوں سے اسلام کو لے کر آگے بڑھا۔ سرحد کے ملک بوس پہاڑ ساتھ ساتھ چلے اسی سورج کی ایک تنویر لبوں پر ابھرنے اور اردو زبان کے قالب میں ڈھلنے لگی۔ یہ دھرتی اس نئے جلوے کی پہلی ممانداراور پہرے دار بنی۔

اردو کی بوباس ہر وقت یہاں موجود رہی۔ شعبۂ اردو کا قیام اس دعوے کی ایک دلیل اور اس زبان میں اہلِ سرحد کی محبت کی ایک علامت ہے۔ سرحد کی سنگلاخ دھرتی پر اردو کی قندیلیں روشن ہوئیں۔ پھولوں سنگریزوں کی اس سرزمین ۱۹۵۶ء کی ایک سہانی صبح پشاور یونیورسٹی کے چمن زار میں اردو کے پھول کھلے یہ پھول پہلے گلدستہ بنا پھر گلستان بن گیا ہے اسی سیمیں برگِ اقدام کی یہ آثارِ جوانی کے پچیس سالوں کا جشن منانے اہلِ علم، اہلِ دفا۔ جمع ہوئے اردو کا یہ شعبہ اردو زبان کے پھیلاؤ، بڑھاؤ اور چڑھاؤ کے لئے ایک مدت سے مصروفِ کار ہے۔ شائستہ نزاہتوں کی سوغات اور شستہ روایتوں کی عادات اس پاکیزہ، زبان کے حوالے سے بٹ رہی ہے۔ اردو مسلم اقدارِ علیٰ کا تابندہ ماضی اور پاک سرزمین کا پائندہ حال اور کشورِ حسین کا شاد باد مستقبل اردو صدیوں کے آئینے میں مسلم نسلوں کے ارتباط اور اشتراک عمل کا سنگِ میل اردو وقت کی آنکھ سے ٹپکا ہوا منور تاج محل اندھیاروں کے لئے زہریلا اہلِ روشنیوں کا بابل ہے اردو کسی کی زبان نہیں۔ اردو ہم سب کی زبان ہے۔ خوشبو کی طرح اردو کا کوئی دیس وطن بھاؤ نہیں ہے۔ یہ شاہوں گداؤں کی امانت۔ علماء و صوفیا کی دیانت محلوں گلیوں چوباروں کی علامت تاریخ کے خوابناک لمحوں کی ذہانت عساکرِ اسلام کی فتوحات کی درخشندہ روایت اور اتحاد و اتفاق ملت کی ضمانت ہے۔ زندہ ہیں وہ لوگ جو اس زبان کی خدمت کر رہے ہیں

شعبۂ اردو کو اپنے آغاز سے ہی اکابر اساتذہ کی رہنمائی حاصل رہی ہے۔ ڈاکٹر مظہر علی خان۔ مولانا عبدالقادر، پروفیسر محمد طاہر فاروقی نے اس باغ کو سینچا، خاطر غزنوی اور اختر جعفری کونپلیں تھیں۔ جو اب پھول بن کر شعبے کے وقار کو مہکا رہے ہیں۔

دونوں معروف شاعر اور فاضل اساتذہ ہیں۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی موجودہ صدر شعبہ ۱۹۶۲ء میں اسلامیہ کالج کے شعبہ انگریزی
سے تشریف لائے۔ آپ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر مکمل دسترس رکھتے ہیں۔ اور ان میں تحقیقی مقالات تحریر
کر چکے ہیں لندن سے انہوں نے اردو زبان وادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ طاہر فاروقی صاحب کی ریٹائرمنٹ
کے بعد وہ بڑی عمدگی کے ساتھ شعبے کی قیادت کر رہے ہیں۔ اس شعبے میں پروفیسر اعجاز الرحمٰن بڑی جانفشانی سے دس بارہ
سال کام کرتے رہے۔ بہت قابل ذہین حسین اور پڑھے لکھے انسان تھے۔ مگر اس ہستی بے بود میں جوں شرر اپنی باری بھر چلے
بلاوا آگیا اور حیران مردِ عین جوانی میں چل بسے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

ڈاکٹر جوہر پراچہ ۱۹۶۴ء سے اس شعبے سے وابستہ ہیں اپنے ہی شعبے سے پی ایچ ڈی کرنے والے پہلے خوش نصیب
ہیں۔ نذیر تبسم شعبے کے لئے نیاخون ہیں تیزی کے ساتھ منزل کی طرف رواں ہیں۔ اس وقت شعبے میں پانچ اساتذہ اور
بیالیس ۴۲ طلباء وطالبات ہیں یوں تو سرحد میں اردو زبان وادب میں ایم اے کرنے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے مگر شعبے میں باقاعدہ
تدریس پاکر ایم اے کرنے والوں کی تعداد ۳۱۶ ہے ۲۰ طلباء ایم اے فل کی تیاری بھی کر رہے ہیں شعبے کی سیمینار لائبریری میں ہزاروں کتابیں موجود
ہیں شعبے کا وقیع مجلہ خیابان ادبی مجلوں میں ممتاز مقام کا حامل ہے اس مجلے نے شعبہ اردو کی ساکھ کو سارے ملک کے علمی اور تعلیمی اداروں میں بلند کر دیا ہے

بایں ہمہ تدریس وتعلیم کی کرامت عمارتوں سے ظاہر ہوتی ہے نہ کتابوں اور نصابوں سے۔ لفظ تو بس لفظ ہی
سکھاتے ہیں۔ آدمی بنانے کے لئے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ شعبہ اردو اس لحاظ سے ایک خوش بخت ادارہ ہے جس
کے دنکا میں کئی بادن گزرے اپنے وزن سے شعبے کے وقار میں اضافہ کرتے رہتے ہیں، شعبہ اردو کے اساتذہ کی
محنت وذہانت طلباء وطالبات کے اذہان وقلوب میں علم وادب کی وہ جوتیں جگاتی ہیں جن کی درخشندگی کبھی ماند نہیں پڑے
گی۔ آغاز کی بے سروسامانی کے عالم سے اہل بصیرت اساتذہ ایثار وقربانی کی شمعیں جلاتے آرہے ہیں فہم وفراست کے
دیئے ہر طرف جگمگا رہے ہیں اور ذوق ادب کے نکھار سنوار کا اہتمام ہو رہا ہے۔ اپنے شعبے سے پڑھ کر نکلنے والے ملک
کے گوشے گوشے میں گیسوئے اردو کی سجاوٹ میں مصروف ہیں شعبے میں تدریس کا کام بڑے سلیقے سے سرانجام پاتا ہے،
اساتذہ محبت وشفقت سے قدم قدم پر طلباء وطالبات کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ سیمیناروں کا انعقاد ہوتا ہے
توسیعی لیکچروں کا بندوبست کیا جاتا ہے۔

شعبہ اردو یونیورسٹی بھر میں شائستگی اور حیا داری کی تصویر ہے۔ گو تعلیم مخلوط ہی ہے لیکن ایک زمانے تک طلباء وطالبات
کے درمیان پردے کا اہتمام تھا۔ یہ پردہ اردو ادب کے قرینے ادبی روایات وضع دارانہ رکھ رکھاؤ اور شاعرانہ رمز وایمائیت
کا آئینہ دار ہے۔ مرحوم طاہر فاروقی اس پردے کے لئے کٹ مرنے کو تیار تھے۔ اللہ اللہ کیسے مرد توانا ودانا تھے جلال
وجمال کی صحیح تصویر تمازت حسن کی صحیح تنویر لفظوں کی موج اور لہجے کے طوفان سے سوچ کو مدبر تابخشش دیتے تھے۔
مزاج میں نیکھا پن تھا۔ تبحر کے ساتھ تہور بھی شامل تھا اس میں غیظ کا اضافہ ہو جاتا تو طلباء لرزہ براندام ہو جاتے۔

سچ ہے وہ شعبے کی آن تھے۔ شعبے کے قدیم طالب علم اور استاد ڈاکٹر مرتضیٰ اختر جعفری پُر تمکنت کون وقار دھیرے دھیرے مسکراہٹوں کی فیاضیاں کرتے ہوئے سر نہوڑائے اردو کی خدمت میں ۲۵ سالوں سے معروف ہیں۔ بڑے باپ کے، بڑے بیٹے شعبے کی جان ہیں۔ اپنے جسم کی طرح دل بھی بڑا رکھتے ہیں۔ پروفیسری ڈاکٹری کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے۔ انسانی رشتوں پہ جان کبھی دیتے ہیں لہجے میں مٹھاس لبوں پر مسکراہٹ، مزاج میں ٹھنڈک اسلوب میں مزاح کے عناصر پائے جاتے ہیں، بے غرض اور بے ریا انسان ہیں۔ شاعر ہیں گاہے گاہے اچھے شعر کہتے ہیں۔ مگر شاعری ان کا اشتہار اور کاروبار نہیں۔ علم میں علم کو گھول کر اور مروت کی چاشنی ملا کر انسانی رشتوں کو سلک گہر میں پرو دیتے ہیں مکتب کی کرامت کے ساتھ فیضان نظر کی تاثیر کے بھی قائل ہیں دل ڈھانے کے بدلے میں سارا جہان ڈھانے سے گریز نہیں کرتے اچھے اور میٹھے انسان ہیں اپنے وزن اور وقار سے شعبے کو بھر دیا ہے۔

انجمن آرا خاطر غزنوی ہمہ جہت شخصیت کے مالک سب رنگ انسان ہیں ادب و فن کی خدمت ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ شاعر۔ ادیب۔ صحافی۔ مقرر۔ معلم۔ سبھی کچھ ہیں تعلقات عامہ ان کا خاص شعبہ ہے۔ علم کی تلاش میں چین تک ہو آئے ہیں مگر چین نہیں آیا۔ جدید شاعری میں اپنا مقام رکھتے ہیں، دانشمند۔ دانشور آدمی ہیں، تدریس اور تقریر کے دوران فطانت کے نکات متانت کے ساتھ بانٹتے رہتے ہیں، شعور مند اور حوصلہ مند انسان ہیں۔ دل دے کر درد خریدتے ہیں اس لئے دل کا روگ لگا بیٹھے ہیں ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے کھو کر لوگوں کو پہنچانتے ہیں ان سے پہلے ہر گلی میں ان کے افسانے پہنچتے ہیں ذوق صحیح سے مزین کامل استاد ہیں جو طلباء کے اندر علم کی ریت اور محنت کی پریت اگا دیتے ہیں تحریک کو زندگی مانتے ہوئے مسلسل روبہ عمل رہتے ہیں، شعبے کی شناخت اور اشتہار ہیں اور سچ ہے کہ شعبے کی شان ہیں۔

ڈاکٹر جوہر پراچہ محنت دریاضت کی چلتی پھرتی تصویر ہیں، تعلیم کے لئے محنت شاقہ اور خون پسینہ ایک کر دینے کے قائل ہیں ڈوب کر پڑھاتے ہیں ہمدرد استاد ہیں اور ہمدردیاں جیت لیتے ہیں، طلباء کی سطح پر اتر کر ان کو ساتھ لے کر چلنے کے قائل ہیں آسان کو مشکل بنانے کی جگہ مشکل کو آسان بنانے کی سعی کرتے ہیں ذہانت کی شمع جلا کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ طلباء میں اعتماد کی قوت پھونک کر ان کو توانا کر دیتے ہیں۔ شعبہ اردو کے لئے جوہر پراچہ سے جوہر نایاب بن چکے ہیں۔ جوہر صاحب کی ترقی کا نشان اور مستقبل کا وسیع امکان ہے۔

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی صدر شعبہ کہنہ مشق استاد جید نقاد اور بے مثل قلم کار ہیں سنجیدہ باوقار اور صاحب کردار، انسان ہیں تحقیق۔ تدقیق اور تاریخ نگاری رکھتے ہیں حق استادی کما حقہ ادا کرتے ہیں۔ تدریس کی تقدیس کے قائل ہیں گفتگو میں گہرائی اور صفائی ہے۔ بات ناپ تول کر کرتے ہیں۔ تعلیم و تدریس کے علاوہ باقی سب مشاغل کو فالتو جانتے ہیں علم و تعلیم کی چلتی پھرتی تعبیر ہیں۔ ان کی محفل میں بے علم بور اور بے ادب بیزار ہو جاتے ہیں۔ متانت، ذہانت اور دیانت کی منہ بولتی تصویر ہیں، مہذب و معقول غیر جذباتی انسان ہیں۔ اصول و ضوابط کے مطابق زندگی کرنے کا قرینہ جانتے ہیں۔ تفکر و تعقل،

وتدبران کے مزاج کے گہرے رنگ ہیں۔ اخلاص دردمندی سے پوری زندگی عبارت ہے۔ تکمیل پسند اور کاملیت کے متلاشی ہیں۔ انسانی جوہر کا شیرازہ بے لوث شرافت کا شہداں کے روپ ہوی کی شناخت ہے۔ ستائش صلے اور تعریف کے میٹھی خواہاں ہستیوں سے گریزاں رفعت علم کی طرف ہر دم رواں اپنے مضمون کے فاضل اجل صاحب تدبیر گمبھیر استاد شعبۂ اردو کے پروہاں۔ طالب علموں کے ماں صدیقی صاحب سند لفظوں کا جادو جگا کر محفل علم میں چاند سجا رہے ہیں۔ اور علم وفضل کے پاکیزہ ذوق سے بالیدگی کے پھول اگا رہے ہیں ان کے پاس بیٹھ کر سائنسہ ہونے کو جی چاہتا ہے ان کی قیادت میں شعبہ منزلوں پر منزلیں مارتا جا رہا ہے۔

قصر اردو کی یہ قندیلیں گزشتہ ۲۵ سالوں سے علم وادب کے ایوانوں کو جگمگا رہی ہیں۔ انہوں نے جشن سیمیں برپا کر کے قدیم طلبا کے لئے ماضی اور جدید طلبا کے لئے مستقبل کے پرُ صدا دریچے وا کر دیئے ہیں۔ یہ میل ملاپ کا ایک خوبصورت بہانا تھا جب ماضی حال سے گلے ملتا نظر آ رہا ہے۔ حال مستقبل میں جھانک رہا تھا پچیس سال پہلے کے بانکے سجیلے نوجوان وقت کی لکیروں اور چاندی کو چہروں اور سروں پر لئے موجود تھے۔ اگلے وقتوں کے بھڑکیلے جوان مضمحل بڑھاپوں میں ڈھل گئے تھے۔ یاروں کی دیوالی کا سماں تھا۔ وقت کی گود میں گم ساتھی ایک دوسرے کو پار رہے تھے۔ گلے مل رہے تھے۔ استادوں کے احترام میں بچھے جا رہے تھے۔

شعبہ اردو میں عید کا سا سماں تھا۔ آج کے طلبا کل کے طلبا کے لئے نگاہیں فرش راہ کئے میزبانی کے چھتر لئے حاضر تھے ہوں کی کھنک۔ رنگوں کی دھنک اور خوشبوؤں کی مہک شعبے کے در و بام میں بسی تھی۔ ہر چہرہ شاد اور ہر دل آباد نظر آ رہا تھا۔ اساتذہ کرام اپنے ہرے بھرے چمن میں کھلے ہوئے شاداب پھولوں کو دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہے تھے۔ چوتھائی صدی پیشتر کے مفرور لمحوں کو وقت کے چہرے سے نوچ کر زندہ کیا جا رہا تھا۔ شعور کی نوکیلی سلاخوں سے تحت الشعور اور لاشعور کی راکھ کو کرید کر انگاروں کو تلاش کیا جا رہا تھا۔ طاق نسیاں کی گرد میں گم نقوش کو ابھارا سنوارا جا رہا تھا۔ سوکھے ہوئے پھول کتابوں سے نکل کر بغل گیر ہو رہے تھے شرابیں شرابوں میں مل رہی تھیں۔ عمر رفتہ کو آواز دے کر کیفیت چشم کے ساغر گھنگنائے جا رہے تھے۔ نشاط و انبساط کے بربط گنگنا رہے تھے۔ شعبہ اردو دو روزہ جشن سیمیں کی مے سے سرشار خوشگوار لمحوں کے نذرانے سمیٹ رہا تھا۔

کل کے شاگرد آج کے استاد تھے، مگر استادوں کے سامنے سراپا نیاز تھے۔ استادوں نے لذت کام و دہن کے ساتھ کیف ذہن و سخن کا انصرام بھی کر رکھا تھا۔ غذائے شکم کے ساتھ ساتھ غذائے قلب و دماغ کا بھی اہتمام تھا۔ سلور جوبلی کے شرکا کچھ دینے کے ساتھ کچھ لینے بھی آئے تھے۔ پر مغز مقالوں اور پرلطف مشاعروں کا بھی انتظام موجود تھا۔ شعبہ کے فارغ التحصیل اور زیر تعلیم طلبا کے علاوہ مہمان ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کی ایک کھیپ بھی موجود تھی۔ اردو اور غالب کے طرفدار شعبے کی کارکردگی کا تماشہ کرنے مہمان بن کر آئے تھے۔ تقریبات میں غزل کی رہنمائی اور نظم و ضبط حید تھا۔ وقفوں میں داد کے طور پر چائے پانی کا بھی بندوبست تھا۔ قرینے کی لڑی میں پروئی ہوئی یہ تقریبات شعبے کے حاضر طلبا اور مستعد اساتذہ کے حسن انتظام کا منہ بولتا ثبوت ہیں

جشن کی افتتاحی تقریب یونیورسٹی کے سائنس ہال میں ۴ اکتوبر کی صبح دس بجے ڈاکٹر جی ایم خٹک وائس چانسلر

یونیورسٹی کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مرتضیٰ اختر جعفری نے شعبے کے قدیم ترین شاگرد اور استاد کے ناطے شعبے کی کارکردگی کا تجزیہ پیش کیا جو تجزیہ کم تاثریہ زیادہ تھا۔ مولانا فضل معبود، منور رؤف اور آنسہ شاہینہ کاظمی نے پرانے چراغوں کے حوالے سے قدیم وجدید تاثرات کی جھلکیاں پیش کیں۔ پروفیسر فتح محمد ملک صدر شعبہ مطالعہ پاکستان قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد نے "جدیدیت کا عصری روپ" کے عنوان سے مقالہ پیش کیا قبل ازیں ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے گذشتہ پچیس سال کی شعبے کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ اس جشن میں جو حضرات شرکت نہ کر سکے تھے انہوں نے اپنے پیغامات بھیجے جن میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی سابق وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی (جن کے زمانے میں شعبہ شروع ہوا تھا) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان سابق صدر شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی ڈاکٹر عبادت بریلوی سابق صدر شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی، عبدالہاشم خان وزیر تعلیم صوبہ سرحد اور ڈاکٹر سید عبداللہ ادارہ المعارف پنجاب یونیورسٹی لاہور کے نام قابل ذکر ہیں۔

دوسری تقریب دوپہر کے کھانے کے بعد ایک مشاعرے کی صورت میں مظفر علی سید کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔ اس مشاعرے میں نذیر تبسم، آل اطہر آنس، ... راحان نقری، عزیز اعجاز، ناصر علی سید، تاج سعید یوسف رجا، نظیر صدیقی، شمیم بھیروی، نبی بخش گوہر، ڈاکٹر مرتضیٰ اختر جعفری، خاطر غزنوی، محسن احسان، رضا ہمدانی اور صدر مشاعرہ مظفر علی سید نے اپنا کلام پیش کیا۔

اگلے روز ۵ اکتوبر شعبہ اردو میں اردو اور اسلام کے موضوع سے ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوا پہلی نشست کی صدارت اقبال اکیڈمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر معزالدین نے کی اس میں درج ذیل مقالات پڑھے گئے۔

۱۔ اردو کی قومی شاعری — محترمہ دشوار ابراہیم
۲۔ بلوچستان کے اردو نعت گو شعرا — جناب ڈاکٹر انعام الحق کوثر
۳۔ منقبت نگاری — جناب ڈاکٹر مرتضیٰ اختر جعفری
۴۔ ادب کا اسلامی نظریہ — جناب ڈاکٹر شمس الدین صدیقی
۵۔ اسلام کی ترویج و اشاعت میں اردو کا حصہ — جناب ڈاکٹر معزالدین صاحب

چائے کے وقفے کے بعد دوسری نشست منعقد ہوئی دوسری نشست کی صدارت جناب نظیر صدیقی شعبہ اردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے کی اس نشست میں درج ذیل حضرات نے مقالات پڑھے۔ (۱) اردو زبان کے قومی تقاضے۔ جناب ایوب صابر ایبٹ آباد (۲) اردو میں نعت گوئی۔ جناب خاطر غزنوی صاحب۔ (۳) اردو اسلام اور پاکستان۔ پروفیسر شمیم احمد بلوچستان یونیورسٹی۔

۴۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ قرآن — ڈاکٹر محمد صدیق شبلی۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

۵۔ اردو اسلام اور تخلیقی ادب۔ — ڈاکٹر نظیر صدیقی۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

ہر مقالے کے بعد آخر میں سوال وجواب کے سیشن ہوئے۔ سیمینار کے اختتام پر مہمان گرامی کے لئے ظہرانے کا اہتمام کیا گیا تھا جو اس جشن سیمیں کی آخری دعوت تھی اس کے بعد یہ دو روزہ جشن سیمیں بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوئی۔

ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری
صدر مجلس استقبالیہ

خطبہ استقبال

صدر عالی قدر مندوبین گرامی۔ مہمانانِ عزیز۔ قدیم و موجودہ طلباء و طالبات

آج کے دن میں خداوند برتر و قدوس کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہوگا اس نے اپنے خاص کرم سے مجھے آج کا پر مسرت اور تابناک دن دکھایا۔ جو شعبوں کی تاریخ میں مدتوں کے بعد آیا کرتا ہے۔

میرے رفقائے شعبہ نے اس شعبے کا قدیم ترین خادم سمجھ کر یہ خوشگوار فرض میرے سپرد کیا کہ میں اس جشن سیمیں کے ان پُر مسرت اور تابناک لمحات میں مندوبین گرامی مہمانانِ عزیز اور قدیم و موجودہ طلباء و طالبات کو پشاور کے سبزہ و گل سے کھلتے اور مہکتے شہر میں عین اس وقت خوش آمدید کہنے کی سعادت حاصل کروں جب کہ یہاں کی صبر آزما گرمی گذر چکی ہے، اور سردیوں کے حسین موسم کی آمد آمد ہے مجھے توقع ہے کہ پشاور کے اس خوشگوار موسم میں یہاں کا قیام آپ کے لئے باعث راحت ہوگا۔ اگر اجازت ہو تو اپنے والد گرامی سید ضیا جعفری مرحوم کے ایک شعر میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کروں

چمن چمن ہے میرا گھر تمہارے آنے سے
مجھے یہ جنت نقش قدم غنیمت ہے

ہم آپ کے بے حد سپاس گذار ہیں کہ آپ نے اپنے گوناگوں مشاغل سے وقت نکالا اور ہماری درخواست کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے سفر کی صبر آزما صعوبتیں برداشت کر کے ہماری مسرتوں میں اضافے کا موجب بنے خدا گواہ ہے کہ میں آج اس قدر خوش ہوں جیسے دنیا کی کوئی عظیم نعمت میرے ہاتھ آئی ہو۔

اس خوشی کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ آج خدا کے فضل و کرم سے ہمارے شعبے نے اپنی زندگی کے پچیس تابناک سال پورے کر لئے ہیں اور یہ دن ایسا ہوتا ہے جو شعبوں میں بڑے انتظار کے بعد آیا کرتا ہے اور دوسرا سبب یہ ہے کہ ہماری پاک سرزمین کے طول و عرض سے اس مملکت خداداد کی کئی مقتدر شخصیتیں اور ان کے ساتھ ساتھ اس شعبے کے قدیم اور موجودہ طلباء و طالبات اس تقریب میں شریک ہیں۔

شعبہ اردو کے جشن سیمیں کی ایک بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ جشن ایسے زمانے میں منعقد ہو رہا ہے جب کہ عالم اسلام پندرہویں صدی عیسوی کے استقبال میں مصروف ہے اور پاکستان میں بھی اس سال کو بڑی شان سے منایا گیا اور منایا جا رہا ہے۔ اس موقع

کی اہمیت کے پیش نظر ہم نے بھی اس جشن میں ایک مجلس مذاکرہ کا اہتمام کیا ہے جس میں وطن عزیز کے تقریباً ہر گوشے سے قابل قدر ہستیاں شریک ہو کر " اردو اور اسلام " کے موضوع پر اپنے زریں خیالات کا اظہار کریں گی ۔

اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو میں اپنے اس شعبے کی زندگی کی مختصر سی روداد آپ کی خدمت میں پیش کروں ۔ اجمال میں تفصیل کچھ یوں ہے کہ شعبہ اردو کا آغاز ۱۹۵۶ء میں ہوا جناب ڈاکٹر مظہر علی خان مرحوم اس کے پہلے صدر شعبہ مقرر کئے گئے ۔ کچھ ذاتی مصروفیات کی بنا پر ۱۹۵۷ء میں وہ شعبے کی صدارت سے الگ ہو گئے اور ان کی بجائے جناب مولانا عبدالقادر مرحوم صدر شعبہ مقرر کئے گئے جو ۱۹۶۲ء تک پشتو اکیڈیمی کے ڈائریکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ اس عہدے پر بھی فائز رہے ۔

شروع شروع میں یہ شعبہ صرف ایک استاد اور دو شاگردوں پر مشتمل تھا ۔ استاد گرامی پروفیسر محمد طاہر فاروقی صاحب مرحوم تھے ۔ جو ۱۹۶۸ء تک شعبے سے منسلک رہے اور شاگردوں میں جناب خاطر غزنوی صاحب اور راقم الحروف شامل تھے ۔ اور آج خداوندِ عالم کے فضل و کرم سے ہم دونوں شعبے سے بحیثیت استاد وابستہ ہیں ۔

ابتداء میں شعبہ یونیورسٹی کے ایک گمنام گوشے میں کھولا گیا جہاں اس کے پاس صرف دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے اب خدا کے فضل و کرم سے اپنی زندگی کے پچیس تابناک سال گذارنے کے بعد پشاور یونیورسٹی کے باوقار شعبوں میں اس کا شمار ہوتا ہے اورینٹل بلاک میں چند کمرے میسر ہیں پانچ استاد اور بیالیس طلباء و طالبات ایم اے کی دو کلاسوں میں اور دو طالب علم ایم فل میں اپنے مطالعے میں مصروف ہیں ۔ شعبہ کی پچیس سالہ زندگی کا تفصیلی جائزہ جناب ڈاکٹر شمس الدین صدیقی صاحب صدر شعبہ اردو پیش کریں گے اس لئے میرا تفصیل میں جانا مناسب نہیں ۔

میں آپ کو خوش آمدید کہنے کی غرض سے آیا تھا ۔ لیکن چونکہ دردِ دل رکھنے والوں کی انجمن ملی اس لئے کچھ دل کا حال بھی کہہ بیٹھا ۔ خدا کرے میری یہ سمع خراشی آپ کو ناگوار نہ گذری ہو ۔ اس کے لئے معذرت چاہتا ہوں ۔ آخر میں اس شعبے کے ایک قدیم ترین طالب علم کی حیثیت سے آپ کا دل و جان سے خیر مقدم کرتا ہوں اور آپ کا بے حد شکر گذار ہوں کہ آپ ہماری دعوت کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے ۔ اپنی تمام تر ضروری مصروفیات سے وقت نکال کر پشاور یونیورسٹی تشریف لائے ۔ خدا کرے ہمارے ساتھ آپ کے یہ چند دن خوشگوار گذریں ۔ ہماری کوشش رہے گی کہ ہم اپنی بساط کے مطابق آپ کی پذیرائی اور مہمان نوازی کا شرف حاصل کر سکیں ۔ اگر وسائل کی کمی کی وجہ سے ہم سے کوئی کوتاہی سرزد ہو جائے تو میں امید کرتا ہوں کہ آپ نہایت فراخدلی سے جشن سیمیں کے منتظمین کو معافی کا مستحق سمجھیں گے ۔

جشنِ سیمیں

شعبہ اردو کے ۲۵ سال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم،

شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی کی عمر اب ۲۵ سال ہو گئی ہے۔ اس شعبے کا آغاز ستمبر ۱۹۵۶ء میں ہوا جب کہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ پروفیسر محمد طاہر فاروقی صاحب مرحوم اس وقت اسلامیہ کالج میں، اردو کے استاد تھے۔ جب یونیورسٹی میں ایم اے اردو کی کلاسیں کھولی گئیں تو فاروقی صاحب نے، نثر، نظم اور افسانوی ادب سبھی پرچے خود پڑھانے شروع شروع میں شعبے کی سربراہی ڈاکٹر مظہر علی خان صاحب مرحوم صدر شعبہ انگریزی، کے ذمے تھی۔ لیکن ۵۸-۱۹۵۷ء کے تعلیمی سال کے دوران میں یہ ذمہ داری مولانا عبدالقادر مرحوم ڈائرکٹر پشتو اکیڈمی کے سپرد ہو گئی۔ جو ۱۹۶۲ء تک یہ فرض انجام دیتے رہے۔

شعبہ اردو کی پہلی کلاس میں صرف دو طالب علم تھے۔ یعنی خاطر غزنوی صاحب اور سید مرتضیٰ جعفری صاحب۔ دونوں نے ۱۹۵۸ء میں ایم اے اردو کی ڈگری درجہ اوّل میں حاصل کی اور دونوں کو شعبے میں لیکچرر مقرر کیا گیا لیکن خاطر غزنوی صاحب مارچ ۱۹۶۲ء سے پہلے شعبے میں خدمات نہ سنبھال سکے البتہ مرتضیٰ جعفری صاحب نے یکم نومبر ۱۹۵۸ء سے شعبے میں فاروقی صاحب کے رفیق کار کی حیثیت سے کام شروع کر دیا ۱۹۵۹ء میں سید امجد الطاف صاحب بھی شعبے کے تدریسی عملے میں شریک ہو گئے لیکن پونے دو سال بعد واپس سکینڈری بورڈ لاہور چلے گئے۔ ۱۹۶۲ء میں ایک خاتون لیکچرر درشہوار صاحبہ کا تقرر ہوا جنہوں نے اس شعبے میں پڑھ کر درجہ اول میں ایم اے کیا تھا مگر وہ جلد ہی پشاور یونیورسٹی کے ڈگری کالج برائے خواتین میں چلی گئیں۔ جنوری ۱۹۶۲ء میں شعبے کی سربراہی فاروقی صاحب کے ذمے ہوئی اور مارچ ۱۹۶۲ء میں خاطر غزنوی صاحب اور میاں اعجاز الرحمٰن صاحب شعبے کے تدریسی عملے میں شامل ہوئے۔ اعجاز صاحب جناح اسلامیہ کالج سیالکوٹ سے پشاور یونیورسٹی آئے تھے اس زمانے میں ایم اے کے علاوہ بی اے آنرز کی کلاسیں بھی، اردو میں شروع ہوئیں اور تدریسی عملے میں اضافے کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ اسلامیہ کالج سے انگریزی کے استاد شمس الدین صدیقی کو شعبہ اردو میں منتقل کر دیا گیا جو انگریزی اور اردو دونوں میں ایم اے کی ڈگری کے حامل تھے۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء میں انہیں پشاور یونیورسٹی نے تعلیمی وظیفہ دے کر لندن بھیجا تھا کہ وہ ادبی و علمی تحقیق کی تربیت حاصل کریں۔ وہ اپریل ۱۹۶۷ء میں لندن یونیورسٹی میں سے اردو میں پی ایچ ڈی کر کے لوٹے۔ ۱۹۶۵ء ہی میں خاطر غزنوی صاحب ایک تعلیمی وظیفے پر

چین گئے اور ۱۹۶۶ء میں وہاں سے چینی زبان میں ڈپلوما حاصل کر کے واپس آ گئے اور پھر جب ۱۹۶۸ء میں پشاور یونیورسٹی میں چینی زبان کا شعبہ قائم ہوا تو اُدھر چلے گئے عبدالستار جوہر پراچہ صاحب کا جنہوں نے شعبے ہی میں باقاعدہ تعلیم پا کر طلائی تمغے کے ساتھ درجہ اول میں ایم اے کیا تھا تقرر ہوا۔ فروری ۱۹۶۸ء میں طاہر فاروقی صاحب ریٹائر ہو کر الفرزہ یونیورسٹی چلے گئے جہاں انہیں اردو اور پاکستان سٹڈیز کے شعبے کا صدر اور پروفیسر مقرر کیا گیا تھا ان کے جانے پر ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی کو شعبہ اردو کی سربراہی تفویض ہوئی جو مارچ ۱۹۷۴ء تک یہ خدمت انجام دیتے رہے اپریل ۱۹۷۴ء سے مارچ ۱۹۷۶ء تک شعبے کی سربراہی کے فرائض ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری صاحب نے انجام دئیے اور اپریل ۱۹۷۶ء میں یہ منصب پھر ڈاکٹر صدیقی کو تفویض ہوا اور وہی اس ذمے داری کو ابھی تک سنبھالے ہوئے ہیں۔

جنوری ۱۹۷۶ء میں شعبے کے ایک استاد میاں اعجاز الرحمٰن صاحب اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے اور اس خلا کو پُر کرنے کے لئے سوم اکنامکس کالج میں اردو کی اسسٹنٹ پروفیسر بیگم منور رؤف کی خدمات جُز وقتی طور پر حاصل کی گئیں نومبر ۱۹۷۷ء میں اسلامیہ کالج سے ضیاءالرحمٰن صاحب کو شعبہ اردو میں منتقل کیا گیا جو جون ۱۹۸۰ء تک شعبے میں خدمات انجام دے کر پھر واپس اسلامیہ کالج چلے گئے۔ جون ۱۹۷۸ء میں نذیر احمد تبسم صاحب نے شعبے میں لیکچرر کی حیثیت سے کام شروع کیا اور جنوری ۱۹۸۰ء میں خاطر غزنوی صاحب دوبارہ شعبہ اردو میں لوٹ آئے جون ۱۹۸۰ء میں اسلامیہ کالج سے حبیب الرحمٰن سحر صاحب شعبے میں منتقل ہوئے تھے لیکن اگست ۱۹۸۰ء میں ان کی خدمات ناظم تعلیمات صوبہ سرحد نے حاصل کر لیں۔ تو ان کی آسامی پر شعبے کی ایک سابق طالبہ نسیم اختر صاحبہ نے وسط دسمبر ۱۹۸۰ء تک بحیثیت لیکچرر کام کیا۔ اسی طرح اب شعبے میں ایک اسامی خالی ہے اور پانچ اساتذہ ہیں جو ایم اے کی دو اور ایم فل کی ایک کلاس کو پڑھا رہے ہیں۔ ایم اے کی کلاسوں میں اس وقت جملہ ۴۲ اور ایم فل میں ۲ طالب علم پڑھ رہے ہیں۔

اسی سال اپریل ۱۹۸۱ء میں شعبے کے ایک استاد جوہر پراچہ صاحب نے ڈاکٹر صدیقی اور ڈاکٹر جعفری صاحب کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کی تکمیل کر لی ہے۔ ان کے تحقیقی مقالے کا موضوع تھا" اردو اور پشتو کے لسانی روابط" شعبے کے تدریسی عملے میں اضافہ ہو جائے تو ایم فل اور پی ایچ ڈی پروگراموں میں مزید توسیع ہو سکتی ہے۔

اس شعبے سے اب تک ۳۱۶ طلبہ وطالبات اردو زبان وادب کی تعلیم باقاعدہ طور پر پا کر ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ جن میں سے چھ نے طلائی تمغے بھی حاصل کئے ہیں ان میں سے اکثر ہائی سکول، کالج یا یونیورسٹی کی سطح پر اردو زبان وادب کی تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ کئی ایک ملک کے ذرائع ابلاغ عامہ مثلاً ریڈیو، ٹیلی وژن اخبارات وجرائد اور محکمہ اطلاعات سے وابستہ ہیں، بعض بری وہوائی افواج سے اور بعض نیم سرکاری، علمی وادبی اداروں سے جو تحریری مقابلے اور ذہنی آزمائش کے پروگرام ہوتے ہیں ان میں بھی شعبہ اُردو کے طلبہ وطالبات حصہ لیتے رہے ہیں اور بعض اوقات انعامات بھی حاصل کئے ہیں۔

شعبہ اردو نے صوبہ بھر میں قومی زبان اردو کو مقبول بنا کر اور اسے فروغ دے کر قومی وحدت کے پیدا کرنے میں بہت مدد دی ہے۔ شعبے کی مخلصانہ کاوشوں کی شہرت بہت دور تک پہنچی ہوئی ہے چنانچہ یہاں نہ صرف شہری و قصباتی علاقوں سے بلکہ چترال، دیر، سوات گلگت، وزیرستان اور شمالی علاقوں سے بھی آ کر طلبہ داخلہ لیتے ہیں۔ شعبے میں باقاعدہ نصابی درس و تدریس کے علاوہ سمینار، بیت بازی کے مقابلوں، تحریری مقابلوں، شعر و سخن کی محفلوں اور اکابر ادب اردو مثلاً اقبال، غالب، سرسید، حالی، شبلی وغیرہ کے بارے میں تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے جن میں شعبے کے اساتذہ کے علاوہ باہر سے بھی اہل ذوق آ کر شرکت کرتے ہیں۔ اپریل ۱۹۷۵ء میں شعبے کے زیر اہتمام ایک کل پاکستان دو روزہ قومی زبان کانفرنس بھی منعقد کی گئی تھی جس میں ملک بھر کے مندوبین نے شرکت کی تھی۔ یہ اس صوبے میں اپنی نوعیت کی پہلی کانفرنس تھی۔ جس میں قومی زبان اردو سے متعلق مختلف مسائل پر مقالات پڑھے گئے۔ تقریریں ہوئیں، قراردادیں منظور کی گئیں اور صوبہ سرحد میں اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دی گئی ہیں۔ انہیں نمایاں کیا گیا۔ شعبہ اردو اپنا ایک مجلہ بھی "خیابان" کے نام سے شائع کرتا ہے اس کے اب تک دس شمارے شائع ہو چکے ہیں جن میں کئی خاص نمبر شامل ہیں مثلاً اقبال نمبر، دانائے راز نمبر، غالب نمبر، شرر نمبر، انیس نمبر، طاہر فاروقی نمبر اور پاکستانی زبان و ادب نمبر۔ ملک کے ادبی حلقوں میں یہ خاص نمبر اس قدر پسند کئے گئے کہ انہیں کتابی شکل میں شائع کر کے شائقین کی مانگ پوری کرنی پڑی۔ مجلہ خیابان نے پشاور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی ساکھ سارے ملک کے علمی و تعلیمی اداروں میں بلند کر دی ہے اس مجلے کے لئے بیشتر مضامین شعبہ اردو کے اساتذہ، سابق طلبہ اور صوبہ سرحد کے اہل قلم سے لکھوائے جاتے ہیں تاکہ ساری ادبی دنیا کو پتہ چل جائے کہ اردو زبان و ادب کی خدمت میں کیفیت اور کمیت ہر دو لحاظ سے صوبہ سرحد کسی اور صوبے سے پیچھے نہیں ہے اگلا شمارہ انشاء اللہ جشن سیمیں ہوگا۔

شعبے کے موجودہ اور سابق اساتذہ نہ صرف اردو میں اپنی تخلیقی نظم و نثر کے لئے بلکہ تراجم اور تحقیقی تنقیدی علمی تاریخی اور نصابی کام کے لئے معروف و مشہور ہیں اور اُن کا کام شائع بھی ہو چکا ہے جو قومی اور بین الاقوامی کانفرنسیں اور مجالس مذاکرہ پاکستان میں منعقد ہوتی ہیں ان میں وہ شرکت کر کے مقالے پڑھتے اور صوبہ سرحد اور پشاور یونیورسٹی کی نمائندگی کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں۔ مثلاً علاقائی زبانوں کی قومی کانفرنس لاہور ۱۹۵۸ء، انجمن مصنفین کی کانفرنس، کراچی ۱۹۵۹ء اردو تدریس کانفرنس لاہور ۱۹۶۳ء، اردو کانفرنس کوئٹہ ۱۹۶۴ء، اردو تدریس کانفرنس کراچی، ۱۹۶۴ء غالب صدی سمینار پشاور ۱۹۶۹ء بین الاقوامی مذاکرۂ غالب لاہور ۱۹۷۰ء بین الاقوامی اورینٹل کانفرنس بسلسلہ صد سالہ تقریبات اورینٹل کالج لاہور ۱۹۷۲ء، بین الاقوامی البیرونی کانفرنس پشاور ۱۹۷۳ء، قومی مذاکرہ ثقافتِ پاکستان اسلام آباد ۱۹۷۴ء، کل پاکستان زبان و ادب کانفرنس اسلام آباد ۱۹۷۵ء، موسیقی کانگریس لاہور ۱۹۷۵ء، ڈراما کانفرنس پشاور ۱۹۷۵ء، سات سو سالہ یادبود امیر خسرو اسلام آباد ۱۹۷۵ء، امیر خسرو سمینار اسلام آباد، یونیورسٹی ۱۹۷۵ء ادبی مذاکرہ امریکی محکمہ اطلاعات نتھیا گلی ۱۹۷۵ء

بین الاقوامی سیرت کانفرنس پشاور ۱۹۷۶ء، قومی مذاکرہ قائداعظم پشاور یونیورسٹی ۱۹۷۶ء، قومی زبان کانفرنس پشاور یونیورسٹی ۱۹۷۶ء، قائداعظم اردو کانفرنس لاہور ۱۹۷۶ء، مذاکرہ زیر اہتمام پاکستان کونسل آف آرٹس اینڈ کلچر کراچی ۱۹۷۶ء بین الاقوامی اقبال کانگریس لاہور ۱۹۷۷ء پاکستان تاریخ کانفرنس کراچی ۱۹۷۷ء، اقبال کانفرنس راولپنڈی ۱۹۷۷ء قومی مذاکرہ بسلسلہ مولانا رومی پشاور یونیورسٹی ۱۹۷۸ء اقبال اردو کانفرنس لاہور ۱۹۷۸ء، تعلیمی کانفرنس لاہور ۱۹۷۹ء قومی و ادبی مذاکرہ زیر اہتمام اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد ۱۹۷۹ء، مذاکرہ عالمی سال اطفال کراچی ۱۹۷۹ء اہل قلم کانفرنس اسلام آباد ۱۹۸۰ء، بین الاقوامی کانفرنس برائے آثاریات، فنون لطیفہ، خطاطی پشاور ۱۹۸۱ء، مذاکرہ قلم قبیلہ کوئٹہ ۱۹۸۱ء قومی، مذاکرہ زیر اہتمام نیشنل بک کونسل آف پاکستان حیدرآباد ۱۹۸۱ء ان سب کانفرنسوں اور مذاکروں میں شعبہ اردو کے ایک یا دو اساتذہ مقالے پڑھ چکے ہیں۔ پشاور یونیورسٹی سے باہر صوبہ سرحد کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں بھی وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ شام ہمدرد، روٹری کلب، پاکستان نیشنل سنٹر، ادبی اکیڈمی، مرکزی اردو بورڈ، اباسین آرٹس کونسل، ریڈیو پاکستان، پاکستان ٹیلی ویژن، پی اے ایف اکیڈمی رسالپور، پی اے ایف بیس پشاور، پی اے ایف بیس کوہاٹ، ایئر ہیڈ کوارٹرس پشاور اور ایسے ہی دیگر اداروں کی طرف سے جب بھی انہیں مدعو کیا جاتا ہے وہ بطیب خاطر دعوت قبول کرتے ہیں اور اپنے علم و فکر سے سامعین و حاضرین کو مستفید ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ وفاقی وزارت تعلیم کی طرف سے ۱۹۷۹ء میں ملک بھر کی اردو کی نصابی کتابوں پر نظر ثانی کر کے اُن سے قابل اعتراض مواد کو خارج کرنے کا وسیع منصوبہ بنایا گیا تھا اس منصوبے کی تکمیل میں بھی شعبے کے اساتذہ نے اپنا کردار کما حقہ ادا کیا۔ اپنے صوبے کی مختلف سطحوں کے لئے نصابی کتابیں مرتب کرنے میں بھی اساتذہ شعبہ اردو ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور وفاقی پبلک سروس کمیشن کے، نصابی کاموں میں بھی اساتذہ نے اعانت کی ہے۔ اس کے علاوہ شعبے کے اساتذہ کو حکومت پاکستان کی طرف سے بیرون ملک کے علمی و ثقافتی دوروں پر جانے والے مختلف وفود میں بھی شامل کیا گیا ہے۔

ایران برطانیہ اور برعظیم پاکستان و ہند کے کئی ممتاز نقاد، محقق، ادیب اور شاعر ہماری دعوت پر شعبے میں تشریف لائے تقریریں کیں مقالے پڑھے اور توسیعی خطبے دیئے۔ مثلاً اس سلسلے کے چند نام یہ ہیں۔ ترقی اردو بورڈ کراچی کے ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم، لندن یونیورسٹی کے پروفیسر رالف رسل جموں یونیورسٹی کے پروفیسر جگن ناتھ آزاد، علی گڑھ یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر قاضی عبدالستار، جامعہ ملیہ دہلی کے ڈاکٹر مسعود حسین خان اور ڈاکٹر عنوان چشتی، دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر عبدالحق، تہران یونیورسٹی کے ڈاکٹر بدیع الزمان فروزانفر مرحوم، ڈاکٹر حسین خطیبی، ڈاکٹر صورت گر اور ڈاکٹر ناظرزادہ کرمانی، میاں بشیر احمد مرحوم، سابق سفیر پاکستان برائے ترکیہ، ڈھاکہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم، سندھ یونیورسٹی کے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، پی اے ایف کے سابق ڈائرکٹر آف ایجوکیشن گروپ کیپٹن نیاض محمود، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر زمان، پنجاب یونیورسٹی کے سابق پروفیسر صحافت ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، پاکستان سول سروس کے جی ایم:

مدنی، انور عادل اور مسرور حسن خان، ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ خان سابق سفیر پاکستان برائے مراکش، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی، ڈاکٹر سید عبداللہ سابق پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور، پروفیسر سید وقار عظیم مرحوم، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، پروفیسر امیر بیگ کراچی یونیورسٹی، ڈاکٹر عبادت بریلوی سابق پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور، ڈاکٹر وحید قریشی پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور، پروفیسر قدرت اللہ فاطمی، جناب اشفاق احمد صدر نشین مرکزی اردو بورڈ لاہور، ڈاکٹر ناظر حسن زیدی پروفیسر ممتاز حسین سابق پرنسپل، سراج الدولہ کالج کراچی. ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم سابق مینجنگ ڈائرکٹر نیشنل بینک آف پاکستان، جن برآوردہ شعرا نے شعبے میں آکر اپنا کلام سنایا ہے ان کے نام یہ ہیں جناب احمد ندیم قاسمی، جناب فیض احمد فیض، جناب صوفی تبسم مرحوم، جناب ضیا جالندھری، جناب ابن انشا مرحوم، جناب جمیل الدین عالی، جناب امجد اسلام امجد، جناب قتیل شفائی، جناب عطاء الحق قاسمی، جناب وزیر آغا، جناب ناصر کاظمی مرحوم، جناب شہزاد احمد، جناب حمایت علی شاعر، جناب صہبا لکھنوی، جناب صادقین، جناب جگر کاظمی مرحوم، جناب ضیا جعفری مرحوم، جناب احمد فراز جناب فارغ بخاری، جناب رضا ہمدانی وغیرہ ہم شعبے کے طلبہ وطالبات کی انجمن، انجمن اردو کے نام سے موسوم ہے جس کے عہدیداروں کے انتخابات خفیہ رائے دہی کے ذریعے کرائے جاتے ہیں، انجمن اردو شعبے کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے.

شعبے میں ابتدا ہی سے اور پابندی کے ساتھ یوم اقبال منایا جارہا ہے اور اس سلسلے میں اقبالیات پر ایک انعامی مقابلۂ مضمون نویسی بالالتزام کرایا جاتا رہا ہے جس کے لئے کتابوں کی شکل میں انعامات اقبال اکیڈمی بطور عطیے کے دیتی رہی ہے طلبہ کی انجمن موسوم بہ انجمن اردو کے عہدے داروں کی کرسی نشینی کے موقع پر ایک مشاعرہ بھی ہر سال ترتیب دیا جاتا رہا ہے. شعبے کے طلبۂ وطالبات کو اسلام آباد، راولپنڈی اور لاہور کے اہم تعلیمی و علمی اداروں اور تاریخی مقامات سے واقف کرانے کے لئے مطالعاتی دوروں پر لے جانے کا انتظام بھی کیا جاتا رہا ہے. صد سالہ تقریبات، ولادت علامہ اقبال کے سلسلے میں پشاور یونیورسٹی کے تقریباً چالیس طلبہ کا ایک وفد نومبر ۱۹۷۷ء میں شعبے کے سربراہ کی قیادت میں مزار شاعر مشرق پر چادر گل چڑھانے کے لئے بھی گیا تھا.

شعبے کی سمینار لائبریری کا آغاز تقریباً تین سو کتابوں سے ہوا تھا. لیکن یونیورسٹی کے ارباب اختیار کی اعانت اور شعبے کے اساتذہ کی علمی دلچسپی کی بدولت اب یہ تعداد سات ہزار کے لگ بھگ ہوگئی ہے جن میں کوئی پانچ سو کے قریب موقر رسائل وجرائد اور آٹھ سو کے قریب نصابی کتابوں کے متعدد نسخے شامل ہیں، سمینار کتب خانے میں تنقید کی صنف میں کوئی ڈیڑھ ہزار، نظم کی صنف میں نوسو، ناول وافسانے کی صنف میں آٹھ سو کتابیں موجود ہیں اس کے علاوہ حوالے کی کتابیں سوانح، تاریخ، مکاتیب، خطبات، مقالات، اقبالیات، غالبیات اور متفرقات کے عنوان سے کوئی ڈھائی ہزار کتابیں ہیں. اتنی کتابوں کی الماریاں شعبے کے ایک کمرے میں نہیں سما سکتیں، مزید گنجائش کی ضرورت ہے.

نہ اتنی کتابوں کی کارڈوں پر فہرست سازی نئے سائینٹفک اصولوں پر کسی تربیت یافتہ شخص کی مدد کے بغیر ممکن ہے۔ ایک تربیت یافتہ لائبریری کلرک کی شدید ضرورت ہے۔ فی الحال شعبے کے ایک استاد ایک غیر تربیت یافتہ جونیئر کلرک کی مدد سے لائبریری کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔

یہ ہے شعبہ اردو کی پچیس سالہ کارکردگی کا ایک طائرانہ جائزہ، جس کی روشنی میں اگر شعبہ یہ دعویٰ کرے کہ "شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم" تو غالباً یہ محض بے جا تعلی نہیں سمجھی جائے گی ہمیں فخر ہے کہ اس شعبے نے اپنی اس مدت حیات میں صوبہ سرحد کی تعلیمی و تہذیبی ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ یہاں کی علمی و ادبی فضا کو جاندار اور تابناک بنانے اور بیرون ملک اور اندرون ملک پشاور یونیورسٹی کا نام اونچا کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہمارے ارادے اور بھی بہت کچھ کرنے کے ہیں یقین ہے کہ ہمیں یونیورسٹی کی انتظامیہ سے برابر تعاون حاصل ہوتا رہے گا اور شعبہ اسی طرح ترقی کرتا رہے گا۔

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی

ڈاکٹر فرمان فتح پوری، شعبہ اردو

اردو میں قرآن پاک کے منظوم تراجم

ہمارے یہاں ایک مدت تک قرآن پاک کے ترجمے کی اجازت نہیں دی گئی دلیل یہ دی جاتی رہی کہ قرآن پاک ایک صحیفۂ آسمانی اور کلام خداوندی ہونے کے سبب کسی ایسی زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا جس کا تعلق عالم مادی یا خاکی سے ہو اور اگر کوئی شخص ایسا کرے گا تو وہ شرعی مجرم ہوگا چنانچہ جس طرح برہمنوں اور عیسائی پادریوں نے بہت دنوں تک وید اور انجیل کی تفہیم کے دروازے عام آدمیوں پر بند کر رکھے تھے بالکل اسی طرح مسلمان علماء نے قرآن پاک کے ترجمے اور مفہوم و معنی سے عام مسلمانوں کو محروم کر رکھا نتیجہ یہ ہوا کہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمان قرآن پاک کی تعظیم و تکریم تو دل و جان سے کرتے رہے لیکن عربی زبان سے ناواقف ہونے کے سبب سترہویں صدی عیسوی تک وہ اس کے مفہوم و مقصد سے یکسر بے بہرہ رہے عیسائی پادریوں نے ان کی اسی غفلت اور لاعلمی سے بڑا فائدہ اٹھایا چنانچہ مشہور فرانسیسی مورخ گارساں دتاسی نے جس نے انیسویں صدی کے وسط میں اردو ادب کی تین ضخیم جلدوں میں تاریخ مرتب کی شاہ ولی اللہ کے ذکر میں اس بات پر سخت افسوس کا اظہار کیا ہے کہ انہوں نے قرآن پاک کا فارسی زبان میں ترجمہ کر دیا۔ گارساں دتاسی کو اصل غم اس بات کا ہے کہ فارسی ترجمہ کے ذریعے قرآن پاک کے معنی و مطالب تک عام مسلمانوں کی رسائی ہو جائے گی اور مسلمانوں کے ساتھ مذہبی مناظروں یا تبلیغی بحثوں میں عیسائیوں کو جو سہولت میسر رہتی تھی وہ اب حاصل نہ رہے گی۔ اس ایک واقعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے علمائے دین نے صدیوں تک قرآن پاک کے ترجمے کو شجر ممنوعہ قرار دے کر ملت اسلامیہ کو کتنا زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ خدا بھلا کرے شاہ ولی اللہؒ اور ان کے بیٹوں کا جنہوں نے علماء کو روشِ عام کے برعکس فارسی اور اردو ترجمہ کی معرفت قرآن پاک کے مفہوم کو گھر گھر پہنچا دیا اس سے دو خاص فائدے ہوتے ایک طرف تو قرآن پاک عوام الناس کے لئے آسان ہو گیا دوسرے اردو نثر کو فائدہ پہنچا۔ ان مقاصد و فوائد کے پیش نظر ضروری تھا کہ قرآن پاک کا منظوم اردو ترجمہ بھی پیش کیا جاتا تاکہ اشعار کی صورت میں اس کے معنی و مفہوم عوام الناس کے ذہن نشیں ہو جاتے جو نثر کے مقابلے میں زیادہ آسان اور دلچسپ ہوتا۔

بحمد اللہ یہ کام حضرتِ اثر زبیری کے ہاتھوں انجام کو پہنچا اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی اور نے اس جانب توجہ نہیں کی۔ یقیناً بعض، دوسرے شعراء نے بھی حسب توفیق و استطاعت اس کی طرف رجوع کیا ہے مثلاً اردو کے ممتاز شاعروں میں حضرت سیماب اکبر آبادی اور آغا شاعر قزلباش نے بھی قرآن پاک کے بعض پاروں کا منظوم ترجمہ کیا ہے لیکن اس سلسلے میں حضرت اثر زبیری کی کامیابی کلّی اور دوسروں کی جزوی ہے بات یہ ہے کہ سیماب صاحب اور آغا شاعر میں سے کسی ایک نے بھی قرآن پاک کا مکمل منظوم ترجمہ اب تک نہیں کیا اور اگر کیا ہے تو وہ ہمارے سامنے نہیں آیا۔ چند پاروں کے منظوم ترجمے یقیناً مطبوعہ شکل میں منظر عام پر آئے ہیں لیکن جزو کی مدد سے کل کا اندازہ کرنا مشکل ہے اس لئے حضرت اثر زبیری کے ترجمے سے ان کا تقابل کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اثر زبیری کا ترجمہ ہر طرح مکمل ہے اور قرآن پاک کے جو

منظوم تراجم اب تک سامنے آئے ہیں ان سب پر بہ وجوہ فوقیت رکھتا ہے۔

اثر زبیری صاحب کا منظوم ترجمہ دو خوبصورت مجلّات میں "سحر البیان" کے نام سے فیبر ونسنز پریس کراچی میں چھپا ہے اور الحجاز پبلشرز کی معرفت شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ یہ شعری ترجمہ لفظی بھی ہے اور آزاد بھی بظاہر کسی منظوم ترجمے میں ان دونوں باتوں کا پایا جانا بہت مشکل ہے لیکن زبیری صاحب کو قرآن کریم کے مطالب کے ساتھ ساتھ عربی اور اردو پر کچھ ایسا عبور حاصل ہے کہ وہ اس مشکل منزل سے نہ صرف یہ کہ آسانی سے گذر گئے ہیں بلکہ ان کے ترجمے کی دلکشی دوچند ہوگئی ہے اس کے لئے انہوں نے دو خاص ترکیبوں سے کام لیا ہے ایک تو یہ کہ پورے ترجمے میں انہوں نے بحر ہزج مثمن سالم یعنی۔ مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن کا استعمال کیا ہے۔ یہ بحر قدرے طویل ہے اور دوسری بحروں کے مقابلے میں اس میں الفاظ کی کھپت زیادہ ہو سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اثر صاحب نے لفظی ترجمے کو شعر کا جزو واصلی رکھا ہے اور آزاد ترجمے کے جزو کو "قوسین" کے اندر رکھ کر واضح طور پر اشارہ کر دیا ہے کہ ترجمے کے یہ الفاظ اور فقرے قرآنی متن سے الگ ضرورت یا تشریح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسا کرنے سے ان کا ترجمہ اتنا واضح ہوگیا ہے کہ قرآن پاک کا مفہوم بڑی آسانی سے قاری کے ذہن نشین ہوجاتا ہے اور ترجمے کا یہی اصل مقصد ہے۔ اثر زبیری صاحب کے ترجمے کا دوسرا وصف یہ ہے کہ اس میں وہ سارے مکنونات ومفاہیم در آئے ہیں جو قرآنی آیت کے لفظ یا فقرے میں مقدر ہوتے ہیں اور جن کے بغیر ترجمے کو مکمل نہیں کیا جا سکتا اور جو اصل متن کے ساتھ ساتھ اس کے پس منظر کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ اثر زبیری صاحب نے اپنے ترجمے کے ذریعے قاری کو ایک خاص حد تک تفسیر کے مطالعے سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اور چند موثر لفظوں میں وہ سب کچھ بیان کر دیا ہے جو کسی آیت کی تفہیم کے لئے ازبس ضروری ہوتا ہے۔ "سحر البیان" کا تیسرا بڑا وصف یہ ہے کہ اس منظوم ترجمے میں قرآنی متن کی صحت کسی جگہ بھی مجروح نہیں ہونے پائی۔ ایک ایک لفظ کے ترجمے میں صحت کا ایسا خیال رکھا گیا ہے کہ عہد حاضر کے تقریباً سارے علماء ومفسرین نے اس کی داد دی ہے اور مستند بتایا ہے۔ ممکن ہے کہ مذکورۂ بالا خصوصیات میں سے بعض خصوصیات دوسروں کے منظوم ترجموں میں بھی نظر آئیں لیکن اثر زبیری صاحب کے منظوم ترجمے میں یہ خصوصیات ایسے ہی اہتمام والتزام کے ساتھ پورے ترجمے پر حاوی ہیں ان کا ترجمہ دوسروں سے ممتاز ومنفرد رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اثر زبیری صاحب کے منظوم ترجمے کی ایک خصوصیت جس کا ذکر میں بطور خاص کرنا چاہوں گا ایسی ہے کہ اس میں کوئی دوسرا ان کا شریک نظر نہیں آتا۔ اس خصوصیت کا بنیادی تعلق اثر زبیری صاحب کی زباندانی اور قادر الکلامی سے ہے انہیں اردو زبان کے روزمرہ پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ وہ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے کو اردو میں حد درجہ سست وروانی کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں ان کا یہ کمال وہاں نظر آتا ہے جہاں مصادر وافعال کی اس خاص لچک اور تکرار سے کام لیا گیا ہے جو اردو کے سوا کسی اور زبان کو میسر نہیں۔ میری مراد یہ ہے کہ اردو کے کسی ایک مصدر مثلاً "کہنا" کو لیجیے اس کے انگریزی، عربی اور فارسی مترادفات یہ ہوں گے To tell، اَلقَولُ، گفتن اب اگر اس سے فعل امر یا حکمیہ جملہ بنانا ہو تو انگریزی میں Tell فارسی میں "بگو" اور عربی میں "قُل" کہیں گے لیکن اردو مصدر کا فعل امر اردو

حکمیہ جملہ اس سے زیادہ لچک دار ہوگا۔ اوّل اس وجہ سے کہ اردو میں ضمیر مخاطب اور متکلم کے سوا ایک لفظ "آپ" بھی ہے جو بطور تعظیم وتکریم بولا جاتا ہے دوسرے اس لئے کہ اس میں بظاہر بعض بے معنی لفظوں کے اضافے سے معنی کے کئی رنگ اور تہیں پیدا کی جاسکتی ہیں مثلاً "کہنا" سے، کہہ کہو۔ کہئے کے ساتھ ساتھ کہہ دو۔ کہہ ڈالو، کہو تو، کہو بھی، کہو تو بھی کہو نا بھی اردو کے روزمرہ میں شامل ہیں اور بامحاورہ اردو میں بڑا لطف دیتے ہیں ان افعال کو "آپ" کی ضمیر کو ذہن میں رکھ کر بولیں تو اور بھی کئی صورتیں پیدا ہوں گی اور حسب ضرورت معنی کے اظہار میں معاون ثابت ہوں گی اثر زبیری صاحب نے اردو مصادر کی اس لچک اور نکتے کو خوب سمجھا ہے اور موقع بہ موقع اپنے ترجمے میں پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن پاک میں "کہیئے" کی جگہ "قُلْ" کا صیغہ بے شمار مقامات پر استعمال ہوا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ کلام الٰہی کی نوعیت چونکہ خدا اور بندے کے درمیان مکالمے کی سی ہے اور اُستاد ازل نے اپنے اشرف تلامذہ کو طرح طرح سے مخاطب کر کے باہم گفتگو اور سوال وجواب کے انداز میں حیات و کائنات کے مختلف نکات و مسائل سمجھائے ہیں اس لیے اس میں "القول" کے صیغے اور مشتقات دوسرے مصادر کی بہ نسبت بہت زیادہ استعمال ہوئے ہیں اثر زبیری صاحب نے ان کے ترجموں میں اُردو اور اپنی قادر الکلامی کا کمال دکھایا ہے اور ایک لفظ "قل" کے ترجمے کو اردو کا موزوں ترین لفظ دے کر نہ صرف یہ کہ اپنے ترجمے کو بامحاورہ بنا دیا ہے بلکہ اس کے ذریعے عربی متن کی روح کو قاری کے قلب و ذہن میں بڑی آسانی سے اتار دیا ہے بات کی وضاحت کے لیے صرف درج ذیل مثالیں دیکھیئے۔

(۱) قُلْ یا اَیُّھَا الکافِرونَ لا اعبدُ مَا تعبُدونَ

منظوم ترجمہ ۔

یہ فرما دیجیئے اے کافرو میں تو نہیں کرتا ∴ عبادت ان بتوں کی جنکی تم سب کرتے ہو پوجا

(۲) قل ھُوَ اللہ احد اللہ الصمد لم یلد ولم یولد

منظوم ترجمہ ۔

یہ کہہ دیجیئے کہ یکتا اور بے پروا وہ مولا ہے ∴ نہ اولاد اس کی ہے کوئی نہ وہ بیٹا کسی کا ہے

(۳) قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ الفَلَق

منظوم ترجمہ ۔

یہ کہیئے مانگتا ہوں میں اماں اس ذات یزداں کی ∴ کہ جو خالق ہے ہنگام سحر کے نور تاباں کی

(۴) قل لمن الارض وَ مَنْ فیھا

منظوم ترجمہ ۔

ذرا آپ اے پیمبرؐ ان سے استفسار فرمائیں ∴ کہ یہ دنیا و ما فیہا ہے آخر کس کے قبضے میں

(۵) قُلِ اللّٰھُمَّ مَالِکَ المُلکَ

منظوم ترجمہ ؎

خدا سے اے پیمبر عرض و معروض اس طرح کیجیے ٭ کہ اللہ اے مالک، تمام اکناف عالم کے

خط کشیدہ الفاظ کے ترجمے پر غور کیجیے "قُل" کے لیے زبیری صاحب نے ایک جگہ "فرمادیجیے" کہا ہے، دوسری جگہ "کہہ دیجیے" استعمال کیا ہے۔ تیسری جگہ "کہیے" سے کام لیا ہے چوتھی جگہ "استفسار فرمائیں" لکھا ہے اور پانچویں جگہ "عرض و معروض" کہا ہے کیونکہ یہ دعائے مناجات کا موقع ہے۔ اسی طرح کا مصرف انہوں نے تقریباً ارود کے ہر مصدر اور اس کے افعال سے لیا ہے اور اپنے ترجمے کو بلحاظ زبان و بیان ایسا سادہ و پرکار بنا دیا ہے کہ وہ اب تک کے منظوم قرآنی ترجموں میں منفرد و بے مثل قرار پاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا ترجمہ ہر حلقے میں مقبول ہوگا اور قرآن پاک کی تفہیم کو آسان بنائے گا۔

فرمان فتح پوری (استاد شعبہ اُردو جامعہ کراچی)

۲۹، دسمبر ۱۹۸۱ء

شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ قرآن

ڈاکٹر محمد صدیق شبلی
صدر شعبہ اردو
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

میں شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی کا بے حد شکر گزار ہوں صرف اس لئے نہیں کہ مجھے شعبے کے جشن سیمیں میں شرکت کی دعوت دی گئی بلکہ میں شعبے کا اس لئے بھی شکر گزار ہوں کہ آج کی اس ادبی تقریب کے لئے موضوعات کی جو فہرست مرتب کی گئی ہے اس میں میرے موضوع "شاہ عبدالقادر کے ترجمہ قرآن" کی گنجائش بھی نکل آئی ورنہ عام طور پر ایسے موضوعات ادبی تقریبوں اور تاریخوں میں کم ہی بار پاتے ہیں کیونکہ سیکولر مغرب سے ادب کا جو نظریہ ہمارے ہاں رائج ہوا اس کی رو سے تو بہت سے موضوعات دائرہ ادب سے خارج ہو گئے۔ اردو کی کسی ادبی تاریخ میں قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر اور کتب تواریخ و سیرت کا آبرومندانہ ذکر شاذ ہی ملتا ہے۔ ہم نے ادبی تاریخ نویسی کا یہ طریقہ مغرب ہی سے لیا ہے لیکن ہم اس معاملے میں مغرب کے مغرب سے بھی زیادہ وفادار واقع ہوئے ہیں کیونکہ جب ایڈورڈ براؤن Literary History of Persia لکھتا ہے تو وہ ادبی کتب کے ساتھ تاریخ وصاف، تاریخ رشیدی، تفسیر بیضاوی اور تفسیر مذاہب علیہ کو بھی نہیں بھولتا ہماری تاریخوں میں یہ اہتمام نہیں ملتا،

برصغیر میں انگریزی تسلط کے بعد ہمارے ہاں سیاسی محکومی کے ساتھ ذہنی غلامی کا بھی آغاز ہوا خدا کے فضل و کرم سے سیاسی محکومی کا دور تو ختم ہوا لیکن ذہنی غلامی کے دور کا ختم ہونا ابھی باقی ہے اس ذہنی غلامی کا ہمیں سب سے بڑا نقصان یہ پہنچا کہ دینی ادب کے ساتھ ہمارا رشتہ کمزور ہو گیا حالانکہ ہمارے ہاں علم دین کے حصول کے بغیر کسی شخص کا شمار اہل علم و ادب میں نہیں ہو سکتا تھا۔ علم کی جدید تقسیم سے آج کے انسان کو ایک جزوی بصیرت کے سوا کچھ بھی نہیں ملا۔ اور اس کی تلافی کے لئے دینی احساس کو تقویت دینے کی ضرورت ہے۔ اس تقویت کا فائدہ ہماری نظریاتی بنیادوں کو بھی پہنچے گا۔ آج اس نظریاتی مملکت میں علم و ادب کے اسی نقطہ نظر کو عام کرنے کی ضرورت ہے جو ہماری علمی و ثقافتی روایت کے انقطاع سے پہلے رائج تھا۔ اس لئے تدریسی ادب میں دینی ادب کو بھی شامل کرنا ضروری ہے۔

خوش قسمتی سے عربی کے بعد اردو دوسری بڑی زبان ہے جسمیں اسلام سے متعلق دینی ادب کا بہت بڑا سرمایہ موجود ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں دین اسلام سے دلچسپی رکھنے والے علما اب یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری جامعات اور خصوصاً ان کے شعبہ ہائے اُردو نے اردو کی اس حثیت کو تسلیم کیا ہے اور اگر کیا ہے تو کیا اُردو کے نصاب میں دینی ادب کے لئے کوئی گنجائش رکھی گئی ہے یا نہیں۔ ہمارے دینی ادب میں تدریسی ادب کا بھی کافی مواد موجود ہے۔ قرآنی تفاسیر میں نقد ادبی کے بہت اچھے نمونے ملتے ہیں، اس طرح تاریخ و سیرت کی کتب میں روایت و درایت کے مباحث تحقیقی مزاج کو پختہ کرتے ہیں علم کلام سے بہتر استدلال کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اور ان سب کے مطالعہ سے طالب علم میں دینی اقدار سے محبت کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی ذہنی پختگی بھی آتی ہے جس سے ادب کی بہتر تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ مغرب میں ترجمے کو آج ایک فن کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے اس کے اصول و قواعد بڑی محنت سے منضبط کئے گئے ہیں۔ لیکن قرآن کے مترجمین نے ترجمہ کے فن پر جو کچھ لکھا ہے اور جس زمانے میں لکھا ہے اسے ترجمے کے جدید اصول و قواعد کے مقابلے میں فخر سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ ۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے قرآن مجید کے فارسی ترجمے کا جو خلاصہ لکھا ہے اس میں انہوں نے ترجمہ کے موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ہمارے علمائے نے قرآن مجید کے مطالب کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کو ہمیشہ ایک بہت بڑی ذمہ داری سمجھا ہے جس میں ذراسی بے احتیاطی کو مترجمین قرآن بڑی خیانت سمجھتے ہیں اور اس لئے ایک مرصے تک قرآن مجید کے ترجمے کا مسئلہ ایک نزاعی مسئلہ بنا رہا ہے اور علمائے نے از سر تو ۱۹۲۸ء تک ترجمے کی مخالفت کے موقف پر قائم رہے لیکن شاہ ولی اللہ دہلوی نے برصغیر کے مسلمانوں کے جملہ امراض کا علاج قرآن مجید میں ڈھونڈا اور ان تعلیمات کو عام کرنے کے لئے انہوں نے شدید مخالفت کے باوجود قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ پھر ان کے فرزندوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر دہلوی نے قرآن مجید کے الگ الگ ترجمے کئے۔

میری معروضات کا اصل موضوع شاہ عبدالقادر دہلوی کا ترجمہ ہے۔ شاہ عبدالقادر کے ترجمۂ کلام پاک مکمل کرنے سے پہلے شمالی ہند میں ادبی نثر کے دو قابل ذکر نمونے ملتے ہیں۔ ایک سودا کا مقدمۂ دیوان اور دوسرا فضلی کی وہ مجلس۔ اگرچہ فضلی کی وہ مجالس ملا واعظ کاشفی، روضۃ الشہدا، کا ترجمہ ہے اور سودا کا مقدمہ طبع زاد ہے لیکن ان دونوں ادبی نمونوں پر تکلف کا رنگ غالب ہے۔ ادبی تحریروں کا یہ رنگ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے کچھ عرصہ بعد تک بھی قائم رہا۔ لیکن دکنی دور کی نثر میں دینی موضوعات کے لئے سادہ اور عام فہم اسلوب نثر کی روایت ملتی ہے کیونکہ دینی ادب میں مضامین و مقاصد کی نوعیت عبارت آرائی و قافیہ پیمائی کی متحمل نہیں ہو سکتی اس لئے شاہ عبدالقادر اپنے ترجمۂ قرآن میں اپنے عہد کی ادبی نثر سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے اپنے ترجمہ کو زیادہ سے زیادہ سادہ اور آسان بنانے کی کوشش کی۔ شاہ صاحب سے پہلے ان کے برادر بزرگ شاہ رفیع الدین نے بھی قرآن مجید کا ترجمہ کیا تھا۔ اور اسے اردو میں عام طور پر قرآن مجید کا پہلا مکمل ترجمہ سمجھا جاتا ہے لیکن یہ ترجمہ اس قدر لفظی اور اردو محاورے کے خلاف ہے کہ اس کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ اس ترجمہ کے اسی مشکل پہلو کے پیش نظر شاید

شاہ عبدالقادر صاحب نے قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کی ضرورت محسوس کی

شاہ صاحب نے اپنے ترجمہ کی خصوصیات کا ذکر مقدمہ موضوع القرآن میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"عاجز نے اب کئی باتیں معلوم کیا چاہیں۔
پہلی یہ کہ اس جگہ معنے لفظ کے جدا جدا ضرور نہیں۔ کس واسطے کہ محاورہ ہندی زبان کا اور عربی زبان کا ہرگز موافق نہیں اگر جس طرح قرآن شریف میں ہے اسی طرح جدا جدا لفظوں کے معنی لکھے تو ہر گز کسی کی سمجھ میں نہ آویں۔ اس واسطے آیت لکھ کر معنے لکھے ہیں۔ دوسری یہ کہ جو ہندی معنے آسان ہیں ہر ایک سے پڑھے جاتے ہیں، پر اسے بھی استادی سند چاہیئے کہ معنے قرآن شریف کے بغیر سند کے اعتبار نہیں رکھتے اور تیسری ملانا اگلی پچھلی آیتوں کے معنوں کو بغیر استاد کے معلوم نہیں ہوتا"

شاہ صاحب کا ترجمہ لفظ بہ لفظ اور ترکیب بہ ترکیب اصل عربی کے مطابق نہیں ہے بلکہ اردو کے محاورے کو سامنے رکھ کر ترجمہ کیا گیا ہے اس لئے اس میں روانی ہے اور عبارت گنجلک نہیں ہونے پائی۔

سورہ بقرہ کی پہلی آیت کا ترجمہ شاہ رفیع الدین نے اس طرح کیا ہے۔

"یہ کتاب نہیں شک بیچ اس کے راہ دکھاتی ہے واسطے پرہیز گاروں کے" اب اسی آیت کا وہ ترجمہ ملاحظہ فرمائیں جو شاہ عبدالقادر نے کیا ہے "اس کتاب میں کچھ شک نہیں۔ راہ بتاتی ہے ڈرنے والوں کو" شاہ عبدالقادر کے ترجمے میں جو صفائی وسہولت ہے وہ پہلے ترجمے میں نظر نہیں آتی اس ترجمے کی چند خصوصیات قابل ذکر ہیں۔

۱) شاہ صاحب نے ہر عربی لفظ کے مقابلے میں اردو کا لفظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کوشش میں وہ بہت کامیاب رہے ہیں مثلاً غافل: بے خبر، فاسق: بے حکم، ظالم: بے انصاف، تاویل: کل بٹھانی، معروف: پسندبات منکر: ناپسندبات، حکمت: کام کی بات۔

۲) شاہ صاحب نے بعض مقامات پر گفتگو کی زبان کو ترجیح دی ہے مثلاً اموات: مردے، کتنی: لیعنے، پالا اسرجی حمیتی: حامی تاگا: دہاگا، ریتا: ریت۔

۳) شاہ صاحب کے ترجمے میں بعض ایسے لفظ بھی ملتے ہیں جو متروک ہو چکے ہیں یا اس زمانے میں بھی وہ ادبی اعتبار نہیں رکھتے تھے۔ مثلاً رچتا بچتا۔ بیٹھنا (داخل ہونا) بچلانا۔ چھپٹیاں پاؤں ڈیگنا۔ جھڑ جھڑنا۔ ہڈیاں کھوکھری ہیں۔ ملونی (مزاج) ڈہوکنا (رغبت کرنا)

شاہ صاحب ترجمہ کرتے وقت عربی قواعد کا زیادہ خیال نہیں کرتے۔ مبشرین ومنذرین: خوشی اور ڈر سناتے سمیع: سنتا۔ بصیر: دیکھتا۔ حکیم: تدبیر جانتا۔ حمید: سب خوبیوں سراہا۔ اللہ کا مال ہے جو آسمان اور زمین میں ہے

۴) شاہ صاحب کے ہاں کہیں کہیں جملہ بندی پر فارسی اثرات بھی ملتے ہیں مثلاً وہ عربی کے لام کا ترجمہ ہمیشہ کو سے کرتے کرتے ہیں جو فارسی را کو دو مترادف ہے۔ سب تعریف اللہ کو ہے یعنی سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ سب کھانے کی

چیزیں حلال تھیں۔ بنی اسرائیل کو، اسی طرح نام جس کا مطلب تاکہ ہے اس کا ترجمہ فارسی کی تقلید میں صرف تا سے کرتے ہیں۔
تا تسکین ہو تمہارے دلوں کو۔

شاہ صاحب کا ترجمہ قرآن مجید ہے اندر لسانی مطالعے کا بڑا مواد رکھتا ہے اس سے اس وقت کی دلی کی زبان اور محاورے کا اندازہ ہوتا ہے اس زبان پر خارجی اثرات کا اندازہ ہوتا ہے اور شاہ صاحب نے لفظ سازی میں جس تخلیقی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے وہ خصوصیت سے قابل مطالعہ ہے۔

پاکستان میں اردو ادب

فنون لطیفہ اور اسلام

ڈاکٹر وحید قریشی

پاکستان میں فنون لطیفہ کا مسئلہ کئی دوسرے مسائل کے ساتھ منسلک ہے۔ نظریاتی ریاست میں فنون لطیفہ کی حیثیت اور اہمیت کا مسئلہ جملہ نظام حیات میں مختلف اقدار کے درمیان ترجیحات کے احساس کا مسئلہ بھی ہے۔ ایک ملت کے طور پر ہماری ضرورتیں کیا ہیں اور کس چیز کو ہم اہم اور کسے غیر اہم جانتے ہیں؟ ترجیحات میں زندگی کے دوسرے اہم معاملات کے مقابلے میں ایک نئی ابھرتی قوم اور اس کے عزائم، ادب اور فنون لطیفہ کو اپنی بقا کے لیے کتنا اہم جانتے ہیں؟ ملک کی فکری اساس کے حوالے سے ان دوائر کے بارے میں ہمارا رویہ کیا تھا اور کیا ہونا چاہیے؟ ملکی اور ملی تصورات اور ادب اور فنون لطیفہ کے مزاج کے درمیان ہم آہنگی ہے یا نہیں۔ اسلام میں ان موضوعات کی کیا اہمیت رہی ہے اور مسلمانوں کی تمدنی تاریخ میں ان کے کون کون سے پہلو زیادہ اہم تھے۔ کون سے پہلو غیر اہم اور کون سے منفی شمار کیے جاتے تھے؟ کیا موسیقی یا مصوری جائز ہے یا ڈرامے کی اسلام میں اجازت ہے؟ ان سوالات سے کئی دوسرے ضمنی اور ذیلی سوال پیدا ہوتے ہیں خصوصاً فنون لطیفہ کے بارے میں رویہ متعین کرنے میں کچھ پہلو ایسے بھی سامنے آتے ہیں جن کا واضح جواب تلاش کرنے کے لئے ایک دو باتوں کا ذکر ضروری ہے۔

اول یہ کہ ادب دینیات نہیں، فنون لطیفہ بھی دینیات نہیں دوم یہ کہ نظریاتی مملکت میں ان دوائر فکر میں غیر اہم اور متصادم عناصر کی نشاندہی ہر پاکستانی کا اولین فریضہ ہے کیونکہ ادب میں غیر اسلامی تصورات اور خلاف اسلام معتقدات اور فنون لطیفہ کے، خلاف اسلام رجحانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۲)

ادب میں بنیادی مسئلہ محض مواد کی ترسیل کا نہیں اس کی پیش کش کا ہے اسے محسوساتی اور تخلیقی سطح پر دیکھنے اور معرض اظہار میں لانے کا ہے۔ اور یہیں سے ادب اور غیر ادب کا فرق شروع ہوتا ہے۔ سماجی علوم میں مواد کی ترسیل کو اصل اہمیت ہے۔ ادب میں مواد کو باطنی طور پر محسوس کرنا اور تخلیقی تجربے کی صورت میں بروئے کار لانا بھی ضروری ہے۔ معمولی درجے کے نعت گو اور اعلیٰ درجے کے نعت گو میں مواد کے لحاظ سے کوئی فرق نہ ہو پھر بھی ادب پارے کی قدر و قیمت متعین کرتے وقت تخلیقی تجربے والی نعت اعلیٰ قرار پائے گی اور دوسری نعت غیر ادب کی صف میں چلی جائے گی۔ دوسرے لفظوں میں ایک مشترک اساس کے باوجود ادب کی جانچ کے معیار اپنے ہیں اور سماجی علوم اور مذہبیات کے اپنے۔ ادبی اقدار میں تو ایک ہی اخلاقی قدر بنیادی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ، انسان نہ صرف اپنے آپ کو دھوکا دے نہ دوسروں کو۔ یہی حال فنون لطیفہ کا ہے۔ ادب اور فنون لطیفہ کے معیار اور پرکھ کے اصول اپنے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے اقتصادیات کے اصول، سیاسیات کے اصول اور سماجی زندگی کے احوال اپنے اپنے ہیں اور ایک ہی معاشرتی

زندگی اور ایک ہی عقیدے سے منسلک ہونے کے باوجود ان کی تفصیلات بھی اپنی اپنی ہیں۔ ادب اور فنون لطیفہ میں مذہب کو بنیاد بنائیں تو تخلیق کار کی داخلی زندگی سے اس کا رشتہ استوار ہونا بھی ضروری ہے۔ ادب و فنون لطیفہ میں دین ایک رد یے، ایک قوی لہر، ایک نکری آہنگ کے طور پر اس وقت جھلکے گا جب فنکار کے باطن سے اس کا رشتہ قائم ہو گا ادب کی جانچ کے معیار بہر حال، ادبی ہی ہوں گے کیونکہ ان کی قدر و قیمت مواد اور صرف مواد پر منحصر نہیں بلکہ مواد اور ہیئت کے ان رشتوں پر ہے جو ادب اور فنون کی سالہا سال کی پیش کش سے وجود میں آتے ہیں تاہم ایک نظریاتی مملکت میں ادب کا وہ مواد جو اسلامی عقائد سے براہ راست متصادم ہو قابل قبول نہیں۔ معاشرہ ایسے ادب کو رد کر دے گا۔ لیکن وہ فن کار جو اسلامی معاشرے کا قائل نہیں، ان اقدار میں یقین نہیں رکھتا اور باطنی طور پر اسے قبول بھی نہیں کرتا۔ اگر اسلام کی بات کرے گا تو وہ منافقت ہو گی ادب تو نہ ہو گا اور اس سے اسلامی معاشرے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہی شاید زیادہ ہو۔ غیر مسلم ادیب اپنے افکار میں جن امور کو دیانت سے بیان کرتا ہے ان میں اسلامی لہر موجود نہیں ہو گی لیکن وہ اگر ادب کے معیار پر پورا اترتا ہے تو ادب ہی کہلائے گا۔

(۳)

مذکورہ سوالات میں سے بعض کا تعلق خاص طور پر دینی مسائل کے ساتھ ہے۔ حلال و حرام کے فیصلے کے لئے قرآن حکیم اور احادیث نبوی کا مطالعہ درکار ہے۔ نیز دینی ادب کا ایک کثیر سرمایہ بھی موجود ہے جس کے حوالے ہی سے یہ مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ ادب کا نقاد اور فنون لطیفہ کا ماہر مذہب کے بارے میں پوری معلومات نہیں رکھتا۔ پاکستان میں اسلام اور اردو زبان دو ایسے مظلوم ہیں جن کے ماہر ہونے کا دعویٰ ہر شخص کرتا ہے۔ حالانکہ عدالتی معاملات اور بعض دوسرے امور میں ہم ماہرین فن کی خدمات حاصل کرنے کے عادی ہیں اور کبھی اپنی ذاتی رائے اور ذاتی تعبیر کو مشعل راہ نہیں بناتے۔ اسلام سے متعلق مسائل کے بارے میں رائے دینے کا حق اس کو حاصل ہو سکتا ہے جو دینی علوم اور عربی زبان پر ماہرانہ دسترس رکھتا ہو اس لیے اسلام میں فنون لطیفہ کی اجازت یا عدم اجازت اور ان سے متعلق خالصتاً دینی معاملات کے بارے میں اظہار رائے سے گریز کرتے ہوئے ہم صرف ان امور کی طرف توجہ کرتے ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کی سماجی تاریخ کے ساتھ ہے فنون لطیفہ کی نشو نما کے بارے میں سماجی مطالعات ہماری کہاں تک راہنمائی کرتے ہیں اور ان فنون میں باہمی ترجیحات کا نظام کیا تھا؟۔۔۔۔۔۔ مثلاً خطاطی، تجلید، تزئین کتب، مصوری اور موسیقی کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ عام طور پر کیا تھا؟ ان فنون کی نشو نما میں اس رویے کا کیا کردار رہا ہے؟ اس رویے نے کیا کیا صورتیں پیدا کیں؟ مسلمانوں کا ابتدائی زمانہ جد و جہد، عمل و حرکت اور تسخیر کا دور ہے جن میں علوم و فنون کی طرف زیادہ توجہ نہ ہو سکی۔ فتوحات کی وسعت کے بعد جب ایشیا میں مسلمانوں کو حکومتیں قائم کرنے کا موقع ملا اور علوم قرآنی کی ترویج ہونے لگی تو کوفہ و بصرہ میں مطالعہ قرآن کے ذریعے بعض علوم و فنون پر خاص طور پر توجہ ہوئی۔ صرف، نحو۔ تجوید کے علاوہ قرآن کی خطاطی نے آرائشی اسالیب کو مقبول بنایا۔ اس سے خطوط کے ارتقا کی داغ بیل پڑی اور آرائشی رسم الخط کے شاخ در شاخ سلسلے وجود میں آتے مسلمانوں کے ہاں۔ باقی فنون لطیفہ کے مقابلے میں خطاطی کو زیادہ مقبولیت ملی۔ تزئین و تجلید کے نئے نئے طرز اور وضع ہوئے۔ مختلف

قرآنی سورتوں کے آغاز کے اوراق پر نقش کاری، تذہیب، خطاطی اور جیومیٹری کی اشکال رقم ہوئیں۔ اس کے ذریعے جمالیاتی تسکین حاصل کی گئی۔ آگے چل کر عمارتوں پر آیات قرآن کے اندراج کا رواج پڑا تو بیل بوٹے بھی بنائے جانے لگے، پتھروں اور لکڑی پر منبت کاری بھی ہوئی اور استعمال کے برتنوں پر بھی کمال فن صرف ہونے لگا چنانچہ ایرانی اثرات بڑھے تو بیل بوٹوں کے علاوہ شعروادب کی کتب میں جانداروں کی تصاویر بھی بنائی گئیں۔ ایرانی مصوروں میں بہزاد کا نام مشہور ہے۔ یہ اثرات برصغیر پاک و ہند میں بھی آئے، شاہناموں، سکندر ناموں اور دوسرے قصے کہانیوں کی کتابوں میں بعض تصاویر پائی جاتی ہیں پھر اکبر کے عہد میں ہندو مصوری کے اثرات بھی ظاہر ہونے لگے۔

جب تک مصوری کا بنیادی رشتہ قرآنی علوم سے رہا جانداروں اور انسانوں کی شبیہوں کا رواج نہیں ہو سکا۔ جب یہ فن اپنے اصل سے الگ ہوا تو اس میں دنیاداری کے انداز بڑھتے چلے گئے۔ پھر بھی ایک احتیاط مدنظر رہی کہ قرآن کی آرائش میں انسانی شبیہہ کا عنصر خارج رکھا گیا اور تصویر کاری کو کبھی تقدس کا درجہ نہیں دیا گیا۔ آج قرآنی خطاطی اور مصوری کے امتزاج سے جو نیا انداز مصوری ظاہر ہو رہا ہے اس سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

بت تراشی مسلمانوں کے ہاں قدیم زمانے میں نہیں تھی، یہ دور حاضر میں مغرب کے زیر اثر آئی ہے۔ پہلے ترجیحات کی فہرست میں اسے کوئی درجہ حاصل نہیں تھا۔ موسیقی کے بارے میں بھی مسلمان معاشرے کا رویہ بے تعلقی کا تھا۔ اس کا کوئی رشتہ، مذہبیات سے نہ تھا اس لئے اس کی حیثیت محض درباروں اور درباری شان و شوکت کی وجہ سے قائم تھی۔

بنوامیہ اور بنی عباس کے دور میں موسیقی اور موسیقار درباروں سے داد پاتے رہے سازوں کا استعمال بھی ہوتا رہا، موسیقی کا رشتہ پہلی بار صوفیا کی خانقاہوں سے استوار ہوا۔ ترانہ، دوبیتی، چہار بیتی یا رباعی ایرانی چیز ہے اس کا استعمال صوفیا کی محافل میں ہوا جہاں رباعیاں گائی جاتی تھیں۔ رباعی کا وزن ایرانی موسیقی کا رہین منت ہے۔ برصغیر میں بھی صوفیا کی محافل میں سماع کا رواج تھا چنانچہ یہ مسئلہ اکثر زیر بحث رہا کہ سماع جائز ہے یا نہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے سلطانی دور میں جب چشتی صوفیا کی کثرت تھی سماع کو پابندیوں کے ساتھ جائز سمجھا گیا۔ شرطیں یہ تھیں:-

۱۔ گانے والا مرد ہو اور ادھیڑ عمر کا ہو۔

۲۔ اس کی شکل و صورت پرکشش نہ ہو۔

۳۔ گانا گانے سے سفلی جذبات بیدار نہ ہوں۔

۴۔ گانا بغیر مزامیر کے ہو۔

صوفیا کی محفلوں سے باہر درباروں میں موسیقی کی زیادہ پذیرائی ہوئی۔ اکبر کا دربار موسیقاروں اور گویوں کے لئے بہت سازگار تھا۔ شاہی پرستی سے موسیقی نوابوں اور راجوں مہاراجوں کے درباروں میں پہنچی۔ آخری مغلیہ دور میں اودھ کی راجدھانی ڈیرے دار طوائفوں اور گائینوں کی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ تھی مغل فرماں روا محمد شاہ بھی اس کے بہت شائق رہے نوربائی گائین کا نام

تاریخ میں یادگار ہے برطانوی دور میں، کپورتھلہ، پٹیالہ اور بعض دوسری ریاستیں خاص طور پر موسیقی کی سرپرستی کے لیے مشہور تھیں۔ اس صورت حال سے دو نکتے واضح ہوتے ہیں۔

۱ - موسیقی اور راگ رنگ کی سرپرستی مذہب کے وسیلے سے نہیں درباروں کے وسیلے سے ہوئی۔

۲ - آخری مغلیہ دور سے راگ راگنیوں کا واسطہ طوائفوں سے متعلق ہو گیا اس لئے موسیقی کو وہ معاشرتی مقام حاصل نہ ہو سکا جو خطاطی یا دوسرے فنون لطیفہ کو حاصل تھا۔

موسیقی مسلمانوں کے فنون میں ترجیحات کے اعتبار سے سب سے آخر میں آتی ہے۔

(۴)

فنون لطیفہ کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے ان فنون کی زیادہ پذیرائی کی جو عملی زندگی یا مذہبی معاملات سے متعلق رہے تھے، وہ کھیل زیادہ مقبول ہوئے جن میں ورزش یا فوجی تربیت کا عنصر نمایاں تھا۔ تلوار چلانے کی تربیت، گھڑ سواری، نیزہ بازی، تن سازی، دوڑ، جنگی مشقیں ان کے مقبول کھیل تھے۔ وہ فنون زیادہ فروغ پذیر ہو گئے جو زیادہ کار آمد اور عملی طور پر مفید یا جمالیاتی حظ اور تفریح کا ایسا پہلو رکھتے تھے جس میں کسی دوسرے مذہب کی عبادت کا رنگ شامل نہ ہو۔

سیاسی سماجی اور دینی و دنیاوی معاملات میں بھی یہی بنیادی اصول بروئے کار تھا کہ اساس قرآنی تعلیمات کو بنایا جائے اور وہ مقامی عناصر جو اس سے متصادم ہوں انہیں اختیار نہ کیا جائے اور جو تفصیلات مفید مطلب اور غیر متصادم ہوں صرف انہیں اختیار کیا جائے۔ نظام حکومت کی تفصیلات کے علاوہ رسم و رواج، لباس، طریق بود و باش ہر جگہ مقامی رنگ کو اختیار کیا گیا اور صرف وہ حصے حذف کیے گئے جو اسلامی تعلیمات کے منافی تھے، یہی اصول ادب، زبان اور فنون لطیفہ میں برتا گیا۔ زبان کے معاملے میں عربی کو اوپر کا درجہ حاصل تھا کہ وہ مذہب کی زبان تھی۔ ثقافتی اور دفتری امور میں فارسی کا چلن رہا اور عام کاروبار حیات میں مقامی زبانیں کام آتی تھیں۔ زبانوں کو اظہار کا وسیلہ بنایا گیا اسے بت بنا کر اس کی پوجا نہیں کی گئی اس لئے مسلمانوں کے عہد عروج میں کبھی کوئی لسانی یا علاقائی فتنہ نہیں اٹھ سکا۔

(۵)

ادب کے معاملے میں بھی یہی روش رہی کہ ادب فکری زندگی کے اظہار کا وسیلہ تھا۔ مسلمانوں کی سماجی زندگی کے پس پردہ کارفرما عوامل میں مذہب کو بنیادی حیثیت اور رتبہ حاصل تھا تاہم آزادانہ طرز فکر کا اظہار بھی ساتھ ساتھ ہوتا رہا۔ مسلم ممالک میں غیر مسلم بھی ادب میں برابر کے شریک تھے۔ انہوں نے بھی اپنے افکار ادب ہی کے وسیلے سے بیان کئے اس لئے یہاں علوم و فنون کے مقابلے میں دنیاوی رنگ زیادہ شروع رہا، اور مذہبی علوم کے مقابلے میں ادب آزاد فکر کا ترجمان ہو گیا۔ مغلوں کے دور زوال میں اور دو ادب پر بھی دنیاوی روپ غالب ہو گیا تھا اس لئے اس میں مذہبی فکر بہت کچھ پس منظر میں چلا گیا۔ برطانوی دور میں اردو میں اکھنڈ بھارت اور متحدہ قومیت کے پرستاروں کا غلبہ تھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد بھی سابقین کی اجارہ داری برقرار ہے ادب

اور سماجی زندگی میں کلچر کے جدید نظریے مزید نتشار پیدا کرنے کا سبب ہیں جغرافیے و تاریخ کے نام پر نئے نئے نظریات کلچر کی تعبیر و تشریح میں استعمال ہو رہے ہیں جن سے ہندمتن کے لئے رستہ صاف ہوتا ہے سی طرح ہڑپہ و موہنجو داڑو کو تہذیبی علامت کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے کلچر کی جگہ سب کلچر پر اصرار نے مقامیت اور علاقائیت کی وبا پھیلا دی ہے. فکر و نظر کا بحران ادب تک ہی محدود نہیں. فنون لطیفہ بھی اس کی زد میں ہیں اور یہاں بھی پاک و ہند کو اکائی قرار دے کر مشترک کلچر کے سہارے فنون لطیفہ میں ہندو اثرات کو نمایاں کرنے کی کوشش ہو رہی ہے. موسیقی میں ہمسایہ ممالک کی مذہبی و روحانی اقدار کو اجاگر کرنے میں ہمارے بعض فدایان موسیقی نے شعوری کوششیں جاری کر رکھی ہیں. اسی طرح مصوری میں غیر مسلموں کی مذہبی روایات کو اہمیت دے کر کلچر کے حوالے سے اسی یلغار کی درپردہ حمایت کا سامان ہو رہا ہے. غیر ملکی سیاسی مقاصد کی تکمیل بالواسطہ اور لطیف طریقہ سے ہو رہی ہے اور عمل کی جگہ جمود اور ترک دنیا کے عناصر کی حوصلہ افزائی سے ادبی اور فنی افق پر ان پہلوؤں کو نمایاں کیا جا رہا ہے جن میں اپنے رنگ کو دھیما اور مخالف رنگ کو ابھارنے کی سر توڑ کوششیں شامل ہیں. رقص میں ہندو دیو مالا کے اثرات اور ہندوانہ طرز بود و باش کی بے محابا نمائندگی اور جنسی ہیجانات کو مذہبی واردات کے روپ میں پیش کرنے کی مساعی بھی انہیں مخفی مقاصد کو پورا کرنے کا وسیلہ ہیں. دوسری انتہا یہ ہے کہ رقص کے مقامی اور محدود پہلوؤں پر بھی ساتھ ہی ساتھ زور دیا جا رہا ہے. مختلف علاقوں کے مقامی رنگ و روپ اس طرح پیش کئے جاتے ہیں جیسے وہ پاکستان کی وحدت کا حصہ نہیں بلکہ ہر علاقے کے امتیازات سب کچھ ہیں. وحدت کی طرف لے جانے والے عناصر کا اخفا اور الگ الگ کرنے والے پہلوؤں پر غیر ضروری اصرار اس تواتر سے ہمارے سامنے لایا جاتا ہے جیسے یہ سارے علاقے اور یہ سارے صوبے کوئی باہمی فکری یا تمدنی رشتہ نہیں رکھتے. بظاہر یہ کھیل اس استدلال پر استوار ہے کہ پاکستان کے مختلف علاقوں کو ان کا حق دیا جا رہا ہے جس طرز سے اس حق کی حمایت ہو رہی ہے اس میں یک جا ہونے کے امکانات کم اور جدا ہو جانے کے ولولے زیادہ ہیں. چاہیئے تو یہ کہ مختلف علاقوں کے متنوع افکار متنوع طرز ہائے حیات کی تہہ میں کار فرما یگانگت اور وحدت پر زور دیا جاتا. عملاً ہو یہ رہا ہے کہ اختلافی پہلوؤں پر تناسب سے زیادہ زور دیا جانے لگا ہے ہم ان مناظر کی تصویر کشی زیادہ مزے لے لے کر کرنے لگے ہیں جہاں یہ علاقے ایک دوسرے سے الگ نظر آئیں پاکستان کے لباس اور پاکستان کے باشندوں کے طریق رہائش کی عکاسی میں اگر ہم وحدت کی تلاش کی بجائے اختلاف کے پہلو پر دجیکٹ کرنے لگے ہیں. تو اس سے وہ مقصد ہرگز حاصل نہ ہو گا جس کے لیے ہم لوگ صوبوں کو اہمیت دیتے رہے ہیں بلکہ اس سے تو اس صوبائی عدم اطمینان کے دروازے اور کھلیں گے اور اس اعتماد کو ٹھیس پہنچے گی جس کی خاطر ہم نے پاکستان کے جملہ علاقوں کو ان کا جائز حق دینے کا عہد کیا تھا.

(۶)

علاقائی پروجیکشن میں بے احتیاطی کا ارتکاب مثبت نتائج کی بجائے منفی نتائج پیدا کرنے کا باعث بن سکتا ہے ہم صوبوں کو ان کا حق دلاتے دلاتے کہیں پاکستان کو اس کے حق سے محروم تو نہیں کرنے لگے؟ پاکستان کے ثقافتی ماہرین کو اگر ملک کے لئے کوئی موثر پاکستانی طریق کار وضع کرنا ہے تو انہیں اپنی ترجیحات کو بھی متعین کرنا پڑے گا اور فنون لطیفہ کی سابقہ روایات کا بھی از سر نو

جائزہ لینا ہوگا۔ بصورت دیگر اگر ہمارا زاویہ نظر یہ ہے کہ ہمارا کلچر اور بھارت کا کلچر ایک ہے یا یہ ہے کہ ہماری ثقافتی روایات علاقائی اصولوں کی پابند ہیں تو پھر پاکستان کی جدوجہد آزادی کا کوئی مطلب باقی نہیں رہتا۔ اگر ہم پاکستانی ہیں تو فنون لطیفہ کے مزاج اور داخلی آہنگ کو ہمارے اقتدار سے کسی نہ کسی شکل میں مربوط کرنا ضروری ہے اس میں صرف وہی غیر ملکی اور مقامی عناصر شامل ہو سکیں گے جو مسلمانوں کے بنیادی فکری نظام سے متصادم نہیں۔ شعوری سطح پر یہ عمل سوچنے اور غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ جو ضروری نہیں کہ فنکار کی داخلی زندگی سے بھی ہم آہنگ ہو۔ داخلی طور پر فن کار اپنے محسوسات کے حوالے ہی سے ان احوال کو ناپے گا۔ اگر اس کی اپنی سوچ اور اس کا اپنا باطنی روپ معاشرے کے تقاضوں سے ہم آواز نہیں یا منافقت پر آمادہ ہے۔ اور خود معاشرہ بھی اپنا پہلا موقف بدل چکا ہے تو پھر ظاہر ہے فنون لطیفہ کی باگ ڈور جن ہاتھوں میں ہے وہ تو اسے کبھی بھی ہمارے نصب العین کے مطابق ڈھالنے کی اجازت نہ دیں گے اور فنکار بھی ان مساعی میں شریک ہونے سے گریز کرے گا۔ فکری اور تخلیقی دونوں سطحوں پر فنون لطیفہ اور ادب کے بارے میں مخصوص ملی رویے کی تلاش کے بغیر پاکستان میں فنون لطیفہ اور ادب کا مستقبل یا محض سیاسی حربہ ہے یا محض فکری انتشار۔ ہمیں اپنا راستہ متعین کرنے کے لیے اپنے ضمیر کا از سر نو محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے۔

اردو، اسلام اور تخلیقی ادب

پروفیسر نظیر صدیقی

اردو زبان اگرچہ برصغیر پاک و ہند کی مختلف زبانوں کے امتزاج سے بنی ہے اور اردو ادب کی تخلیق میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کا حصہ بھی وافر رہا ہے لیکن اس کے باوجود اردو زبان اور اردو ادب کا مزاج بڑی حد تک اسلامی رہا ہے۔ اردو زبان کے تار و پود میں جس حد تک عربی اور فارسی جیسی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں اتنی کسی اور زبان کے نہیں۔ اردو میں حمدیہ ادب، نعتیہ ادب، قرآن و حدیث کے تراجم، قرآن کی تفاسیر، فقہ اور عبادات سے متعلق کتابیں سیرت کی کتابیں، مشاہیر اسلام کی سوانح عمریاں، اسلام اور مسلمانوں سے متعلق بے شمار مسائل پر لکھی گئی کتابیں اسلامی تصوف اور فلسفے سے متعلق کتابیں، اسلامی علوم اور مسلم ثقافت سے متعلق کتابیں، اسلام اور مسلمانوں سے متعلق محاورات اور اسلامی تلمیحات کا جتنا سرمایہ اردو زبان اور اردو شعر و ادب میں ملتا ہے، اتنا عربی اور فارسی کے علاوہ غالباً دنیا کی کسی اور زبان اور ادب میں موجود نہیں۔

ان حقائق کے پیش نظر اردو نہ صرف مسلمانوں کی زبان معلوم ہوتی ہے بلکہ خود بھی مسلمان یا مشرف بہ اسلام معلوم ہوتی ہے اگر انسانوں کی طرح زبانوں کو بھی وطنیت، قومیت، مذہب اور ثقافت سے متصف کیا جا سکتا ہے تو اردو وطنیت اور قومیت کے اعتبار سے پاکستانی بھی ہے اور ہندوستانی بھی، جہاں تک اس کے مذہب اور ثقافت کا تعلق ہے اس پر اسلام اور اہل اسلام ہی کی چھاپ زیادہ ہے۔

پچھلی صدی تک جن ہندوؤں نے اردو ادب کی تخلیق میں حصہ لیا وہ بھی اردو ادب کی اسلامی روایات کو برتنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ مثلاً پچھلی صدی تک یہ رواج عام تھا کہ اردو کی ادبی کتابیں حمد نعت اور منقبت سے شروع ہوتی تھیں اس روایت کو ہندوؤں کی لکھی ہوئی کتابوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

پھر جن ہندوؤں کی تعلیم و تربیت میں اردو کو دخل رہا ہے ان کی تہذیب و ثقافت میں اسلامی عناصر آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً اگر انہیں قسم کھانا ہو تو وہ بھگوان کی قسم کہنے کی بجائے واللہ یا بخدا ہی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان تمام باتوں سے اردو کا اسلام پرستانہ مزاج ظاہر ہوتا ہے اردو کی یہ اسلام پرستی ہم مسلمانوں کے لئے قومی مسرت کا باعث ہے خواہ ذاتی اور انفرادی سطح پر ہماری اسلام پرستی جیسی بھی ہو۔

ادبی اور تخلیقی سطح پر بھی اردو اور اسلام کا باہمی رشتہ دیرینہ اور دور رس رہا ہے اردو میں اگر آپ اس شاعری کو زیادہ اہمیت نہ بھی دیں جس کا تعلق حمد نعت اور منقبت وغیرہ سے ہے جب بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہ ہوگا کہ

اردو میں تصوف کی خوبصورت شاعری شروع سے موجود ہے تصوف سے ہٹ کر بھی اردو میں اسلامی شاعری یعنی ایسی شاعری جو اسلامی زاویہ نگاہ اور مسلمانوں کے قومی شعور کی حامل ہے، حالی، شبلی اور اکبر جیسے شاعروں سے شروع ہو کر اقبال جیسے شاعر کی شاعری میں نقطہ عروج پر پہنچی ہے ان بزرگ شاعروں سے قطع نظر انیس اور دبیر کے مرثیے اسلامی موضوعات پر تخلیقی شاعری کے عظیم نمونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جہاں تک اردو نثر کا تعلق ہے نہ صرف داستانوں کے اندر اردو اور اسلام کے باہمی رشتے کو منعکس دیکھا جا سکتا ہے بلکہ نذیر احمد سے لے کر نسیم حجازی تک کے ناول میں بھی اسلامی نقطہ نظر سے تخلیقی اظہار کا کوئی نہ کوئی معیار ڈھونڈا جا سکتا ہے۔

اُردو شعر و ادب کے اس خاکے کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ کیا اسلامی ادب نہایت اعلیٰ معیار کا تخلیقی ادب ہو سکتا ہے تو کم از کم اقبال کی شاعری کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس سوال کا جواب آسانی سے اثبات میں دیا جا سکتا ہے۔ لیکن دور حاضر میں جو سوال بہت سے ذہنوں کو پریشان کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ کیا اسلامی ادب تخلیقی ادب ہونے کے باوجود حقیقت نگاری کا متحمل ہو سکتا ہے۔

اسلامی ادب کا اصلاحی، اخلاقی اور نظریاتی ادب ہونا تو نسبتاً آسان ہے لیکن حقیقت پسندانہ ہونا ایسا آسان نہیں جیسا کہ تصور کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں سب سے پہلے پاکستانی قومی ادب اور اسلامی ادب کا مطالبہ کرنے والے حسن عسکری تھے جن کی مفکرانہ حیثیت اور ناقدانہ عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کی اصطلاحوں کو تقریباً ہم معنی اصطلاحوں کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

۱۹۴۹ء کے ساقی کراچی کی جھلکیاں، میں انہوں نے پاکستانی ادیبوں سے پاکستانی یا اسلامی ادب کی تخلیق کا مطالبہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "پاکستانی یا اسلامی ادب کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں ریاکاری کو مطلق دخل نہ ہو، اگر آپ اسلام کے کسی اصول پر ایمان نہ لا سکے تو اپنے افسانے یا نظم میں اپنا پورا ذہنی اور روحانی تجربہ پیش کیجیے کہ فلاں فلاں نفسیاتی محرکات مجھے ایمان نہیں لانے دیتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر حسن عسکری ہی کے اس تصور کے مطابق اسلامی ادب لکھا جائے تو وہ اسلامی ادب کی اس شرط کو تو حرف بحرف پورا کرے گا جسے حسن عسکری نے اسلامی ادب کی پہلی شرط قرار دے رکھا ہے یعنی وہ ریاکارانہ ادب نہ ہو گا لیکن مجھے اس بات کا یقین نہیں آتا کہ کوئی اسلامی معاشرہ ایسے ادب کو اسلامی ادب ماننے پر آمادہ ہو گا۔ جو اسلام کے معاملے میں لکھنے والے کے تشکک اور تذبذب کا ترجمان ہو۔ مجھے اس کا بھی اندیشہ ہے کہ ایسا ادب لکھنے والا ایسا ادب لکھ کر اپنی عاقبت کو خراب کرے یا نہ کرے اپنی دنیا کو ضرور تباہ کرلے گا

حسن عسکری اردو کے افسانہ نگاروں میں جتنی بلند رائے سعادت حسن منٹو کے بارے میں رکھتے تھے اتنی غالباً کسی اور کے بارے میں نہیں۔ منٹو کے جن افسانوں کو فحش قرار دیا گیا اُن کے بارے میں حسن عسکری نے یہ کہنے میں کوئی

جھجک محسوس نہیں کی کہ بہت سے افسانے جو بعض لوگوں کو بہت فحش معلوم ہوتے ہیں دراصل اس کی اسی طہارت پسندی کے نمونے تھے

حسن عسکری کے شاگرد رشید اور اردو کے ممتاز نقاد سلیم احمد نے ابھی حال ہی میں اسلامی ریاست اور اسلامی ادب پر ایک اخباری انٹرویو میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہہ دیا کہ جو اسلامی ریاست میرے تصور کے مطابق ہوگی اس میں عصمت چغتائی کے افسانہ لحاف، اور منٹو کے افسانہ 'بو' جیسے افسانوں کے لکھے جانے کی اجازت ہوگی. پاکستان کے بعض حلقوں نے سلیم احمد کے اس نقطۂ نظر پر سخت برہمی کا اظہار کیا.

پاکستان کے نشریاتی اداروں کی احتیاط کا عالم یہ ہے کہ اردو کے کسی شعر میں لفظ شراب آگیا ہے یا اگر وہ شعر موجودہ پاکستان پر تنقید کی حیثیت رکھتا ہے تو اسے مسودے سے خارج کر دیا جاتا ہے.

ایک طرف سچ بولنے کی ذمہ داریاں ہیں دوسری طرف سچ بولنے کی دشواریاں ہیں ۔ سچ بولنا ہمیشہ ہی دشوار رہا ہے بلکہ خطرناک بھی۔ اگر معاشرہ یا حکومت سچ بولنے والوں کو معاف بھی کر دے جب بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ شاعری اور فکشن جو تخلیقی ادب کہلاتے ہیں حقیقت نگاری کے فرائض کو پورا کئے بغیر سچا ادب کیسے کہلا سکتے ہیں. سچا ادب بننے کے بعد وہ عام معنوں میں فحش یا غیر اسلامی ہونے سے کیسے بچ سکتے ہیں خصوصاً آج کی زندگی میں یہ تو صحیح ہے کہ زندگی صرف گناہ اور گمراہی نہیں ہے لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ انسانی زندگی میں گناہ اور گمراہی کا تناسب کیا رہا ہے آج کا تخلیقی ادب نہ تو نذیر احمد کا ناول بننے پر قناعت کر سکتا ہے نہ اقبال کی شاعری بننے پر. ادب میں صرف افکار و اقدار کی تبلیغ کافی نہیں، اعمال و احوال کی تصویر بھی ضروری ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بعض علوم کے ارتقا کی روشنی میں مسلمہ اصولوں اور قدروں پر نظر ثانی بھی ایک ضرورت ہے. اس کے لئے اسلام میں اجتہاد کا دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے اپنے ذہن کی کھڑکیوں کو کھول لینا ضروری ہے.

شمیم احمد

اردو، اسلام اور پاکستان

۱۹۵۰ء کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ میں پاکستان میں اُردو کے مستقبل سے پرامید ہوا ہوں۔ ورنہ گذشتہ ۳۱ سال سے اس معاملے میں ، کچھ دل سے تھے ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم !؛ کچھ لوگ میری اس بات سے اُلجھے ہوں گے اور کچھ لوگ بدگمانی کے تحت یقیناً اس جملے میں اپنے اپنے معنے ڈال رہے ہوں گے اس لئے اس جملے کو پہلے واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو کے سلسلے میں قائداعظم کے بعد پاکستان کی کوئی حکومت کسی حقیقی "درد دل" یا "دردِ سر" میں مبتلا نہیں رہی۔ کیونکہ پاکستان کا افسرشاہی حکمراں طبقہ یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ۔ برطانوی استعمار کا حقیقی جانشین نہیں ہے۔ اسے اس بات پر کبھی کوئی خلش نہیں ہوئی کہ ذہنی غلامی اصل غلامی سے بدرجہا بدتر، المناک اور مہلک عارضہ ہوتا ہے۔ ان کے لئے تو برطانوی نظام حکومت اور مغربی تہذیب دونوں ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتے تھے جس سے وفاداری ان کے خون میں رچی بسی ہوئی تھی اور جس سے اُن کے احساس کمتری میں ڈھلے ہوئے وجود کو بھی تسکین ملتی تھی اور طبقاتی مفاد کو بھی۔ انہیں ایک آزاد قوم کے تقاضوں اور آزاد معاشرے کی تعمیری ضرورتوں کا کوئی شعور اور احساس سرے سے نہیں تھا۔ چنانچہ پاکستان کے تمام حکمرانوں نے اب تک جس معاملے کو بغیر کسی تذبذب کے نظرانداز کیا ہے وہ اردو ہے جو ان کے لئے کسی سطح پر کوئی قومی مسئلہ نہیں تھا چنانچہ حکمرانوں کی ہر تبدیلی کے ساتھ قومی کمیشن بٹھانا ہماری اس روایت کا ایک حصہ بن گیا تھا اور ان کمیشنوں کی رپورٹوں میں اردو کے بارے میں یہ لکھنا بھی، اس روایت کا ایک حصہ تھا کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہوگی اور اسے جلد از جلد اختیار کرلینا بہت ضروری ہے۔ گویا یہ قومی سفارشات بھی برطانوی نظام حکومت کے اِن کمشنروں کی رپورٹوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھیں جو اپنے زیرِ انتظام علاقے کے بارے میں وقتاً فوقتاً اعلیٰ حکام کو بھیجتے رہتے تھے۔

یہ روداد سُناکر میں پاکستان کے حکمرانوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کر رہا ہوں۔ کیونکہ لیاقت علی خان مرحوم کے دَور سے لے کر موجودہ دور تک سب کے طرزِ عمل اور اردو کے بارے میں یکساں رویے سے اگر کوئی بات ثابت ہوتی ہے تو یہی کہ پاکستان کی قومی زبان اُردو ہے مگر اسے آزاد پاکستان کی بے زبانی کی تلافی کے لئے اختیار نہیں کیا جاسکتا، ایسا بھی نہیں کہ انہیں اردو کی اہمیت اور ضرورت کا احساس نہ ہو۔ انہیں اردو کی ضرورت اس لئے تھی اور رہے گی کہ، پاکستان کے مختلف علاقوں اور صوبوں کے درمیان رابطے کی زبان کوئی علاقائی زبان نہیں بن سکتی تھی لہٰذا اُنہیں اندرونِ ملک تو اردو سے ایک سطح پر کام چلانا ہی تھا لیکن ہمارے حکمرانوں کی تدبیر یہ رہی تھی کہ وہ اسے "قومی زبان" کا نام بھی دیتے

تھے حالانکہ ان کے ذہن قومی زبان کے ہر تصور سے خالی تھے ان سے بہتر طرزِ عمل تو ان کے سابقہ "صاحبوں" کا تھا کہ انتدار کے ڈیڑھ سو سالوں میں انہوں نے اردو کو برصغیر کی اہم ترین زبان تسلیم کر رکھا تھا کیونکہ وہ برصغیر کے وسیع تر علاقوں میں رابطے کی حیثیت رکھتی تھی جس کی وجہ سے انہیں بہت سی زبانوں کو جاننے کی ضرورت نہیں تھی اور اس لئے انہیں اردو کی سرپرستی سے کوئی عار نہ تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ان کے "ازلی وفاداروں" نے اس صورتِ حال کو برقرار رکھا انہوں نے، ساتھ ہی اردو کو "منہ زبانی" "قومی زبان" قرار دینے کی تدبیر سے کام لیا۔ جس سے ان کی ناعاقبت اندیشی کا پتہ چلتا ہے۔ میں اسے ناعاقبت اندیشی اس لئے کہتا ہوں کہ اردو کو یہ نام دے کر انہوں نے تمام علاقائی تحریکوں اور پاکستان دشمن ذہنوں کا نشانہ تو ضرور بنوا دیا مگر صحیح معنوں میں قومی زبان وہ آج بھی نہیں بن سکی ہے۔

لیکن مجھے اس سے بھی زیادہ بڑھ کر اس پر اصرار ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے اردو کو سیاسی تنازعہ بنانے کی شعوری کوشش کی تھی۔ اور اس محبت کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ اسے علاقائی زبانوں کے مقابل دو بدو کھڑا کر دیا گیا۔ اس مختصر سی روداد سے جو بات سامنے آتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ اردو کو بظاہر پاکستان میں اندرونِ ملک کچھ تعلیمی اور کچھ عوامی تقاضوں کی بنیاد پر صرف رابطے کی زبان تسلیم کیا جا رہا ہے مگر اس کا اصل مقصد برطانوی استعمار کے ڈھانچے کو برقرار رکھنا اور عوام اور حکمرانوں کے درمیان اس فرق کو قائم رکھنا تھا جو انگریزی ہی سے ممکن تھا گویا اردو کو علاقائی زبانوں سے متصادم کرانے کی اصل وجہ انگریزی کو مقتدر بنائے رکھنا تھا۔ اور اس صورتِ حال سے اس مقصد کے حصول میں بڑی مدد ملتی تھی۔

اب دیکھئے ہمارے موجودہ حاکموں کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ جو پہلوں کا تھا کہ وہ اسلام سے پاکستان سے اور اردو سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے ذہن میں بھی اُردو کی اہمیت وہی صرف رابطے کی زبان کے تصور پر قائم ہے ورنہ ہمارے اربابِ حکومت کراچی میں ایک کچہری کے دوران میں ایک خاتون کی معاش فریاد پر یہ نہ کہتے کہ "بی بی اگر آپ نے ایم۔اے کسی مفید اور کار آمد مضمون میں کیا ہوتا تو آپ کے لئے کچھ کیا جا سکتا تھا مگر آپ نے ایم اے کیا بھی تو اردو میں" اگر آپ اس ذہن کا تجزیہ کریں جو اس کے عقب میں کام کر رہا ہے تو وہ اصلاً اس ذہن سے زیادہ مختلف نہیں نکلے گا جو ہماری برطانوی روایت کے نظامِ حکومت کے پیچھے کام کر رہا ہے گویا ہماری حکومت کے لئے اپنی قومی زبان کی اہمیت بحیثیت ایک مضمون اتنی بھی نہیں ہے جتنی کسی بھی "مفید" اور "کار آمد مضمون" کی ہو سکتی ہے مثلاً کیمسٹری، فزکس اور معاشیات وغیرہ کی

اب میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا قومی زبان کی اہمیت صرف اتنی ہی ہوتی ہے؟ کیا زبان اتنا ہی "غیر مفید" اور بے کار مضمون ہوتا ہے جتنا اربابِ حکومت کے ذہن میں موجود ہے! کیا زبان کی کوئی تہذیبی جہت نہیں ہوتی؟ کیا ادبیات معاشرے کا اتنا ہی بے معنی سرمایہ ہوتی ہیں کہ اس سے معاشرے اور فرد پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیا پاکستانی معاشرے کو ذہن اور جذبات کی تہذیب کی کوئی ضرورت نہیں ہے! تخلیقی بات کو تو میں اس لئے چھیڑنا نہیں چاہتا کہ اس سے ہمارے حکمرانوں کے طبقے کو کیا مس ہو سکتا ہے۔ اگر ہوتا تو یہ نوبت کیوں آتی؟ میں تو صرف اتنا معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اردو کو جو برصغیر میں

ہوگیا ہوں تو وہ صرف اتنی سی بات ہے کہ حکومتوں کے عدم خلوص کے باوجود اور اردو کو متنازعہ مسئلہ بنانے کی تمام کوششوں کے باوجود اردو شہروں کے اجارہ داروں سے نکل کر گاؤں گاؤں پھیل رہی ہے۔ چھوٹے چھوٹے قصبات سے اس مہنگائی کے دور میں اردو کے رسالے نکل رہے ہیں اور میں تو صرف اس بات سے خوش ہوا ہوں کہ اس صوبہ سرحد کے ایک چھوٹے سے قصبے بھائی خیل مردان کے ایک خالص پختون صاحبزادے نے اردو تنقید پر تخلیق فن کا نظریہ کے عنوان سے ایسی کتاب لکھی ہے جس کی توقع اردو کے اجارہ داروں کی نئی نسل سے بھی نہیں کی جا سکتی۔

مذہب اور ادب کا تعلق

ڈاکٹر نجم الاسلام
شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی

اگرچہ یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے کہ زندگی سے مذہب کا تعلق نہایت گہرا، بنیادی اور اصلی ہے۔ تو یہ بھی اسی قدر سچ ہے کہ ادب سے مذہب کا تعلق حقیقی، اساسی اور نہایت عمیق ہے اس دنیا کا چھوٹے سے چھوٹا معاملہ ہو یا بڑے سے بڑا مسئلہ انسان کبھی قطعاً خالی الذہن ہو کر نہیں سوچ سکتا۔ اگر اس کے ذہن میں کوئی اچھا خیال نہیں تو وہ برا خیال ہی اپنے اندر لیا لے گا۔ بہر کیف اس کا ایک بنیادی تصور ہوتا ہے۔ جو پیداوار ہوتا ہے۔ مابعد الطبعی تصورات اور اس کے نظریہ کائنات کا۔ یہ ضروری نہیں کہ اس مخصوص نظریہ کی پرورش میں شعوری اور عقلی مدارج کو طے کرنے کا کوئی سوچا سمجھا نقشہ سامنے رکھا جائے۔ ہر انسان کائنات سے اپنے تعلق کو متعین ضرور کر لیتا ہے کہ آیا اس کی حیثیت یہاں ایک خود مختار کی ہے یا اسے کسی بالاتر ہستی کے سامنے جواب دینا ہے؟ وہ اپنے مسائل کے حل کے لئے جس روشنی کا محتاج ہے اسے کہاں سے مل سکتی ہے۔ اسے ایک بامقصد زندگی گذارنی ہے یا یونہی پوری کر کے فنا ہو جانا ہے۔

جو لوگ اس نظام کائنات کو اتفاقی ہنگامہ وجود و ظہور سمجھتے ہیں۔ بے مقصد جانتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ نظام یونہی چل رہا ہے۔ یونہی بے نتیجہ ختم ہو جائے گا۔ انسان بھی یہاں اتفاقاً پیدا ہو گیا ہے اور وہ ایک ایسا جانور ہے جس میں کچھ خواہشیں ہیں۔ ان خواہشوں کی تکمیل بے روک ٹوک ہو سکتی ہے ایسے خیالات رکھنے والے لوگوں کا رویہ اس زندگی کے ساتھ غیر ذمہ دارانہ اور خود سری کا ہونا لازمی ہے۔ ان کی شخصیت سے لے کر اجتماعی معاملے تک خود غرضی اور نفس پرستی چھائی ہوئی ہو گی۔ یہاں تک کہ ادب اور فن بھی اس ذہنیت کے عکاس ہوں گے۔ اس میں عریانی، لذتیت اور جنسی برائیوں کے عناصر بڑھتے چلے جائیں گے۔ اور "بابر بعیش کوش" کا نظریہ غالب ہو گا۔

ایک دوسرا مابعد الطبعی نظریہ یہ ہے کہ کائنات کا یہ نظام بے خدائے تعالیٰ اور اتفاقی تو نہیں مگر اس کا ایک خدا نہیں بہت سے خداوند ہیں۔ اور سعادت و شقاوت کامیابی و ناکامی نفع و نقصان بہت سی ہستیوں کی مہربانی اور نامہربانی پر منحصر ہے ان خیالات کا اثر طرز فکر و عمل پر پڑتا ہے کہ آدمی کی پوری زندگی اوہام کی آماجگاہ بن جاتی ہے تجریدیت کا ایسا زور ہوتا ہے کہ محبت، حسن، بیماری، جنگ۔ قوت تخلیق جیسی چیزوں کو بالاتر قوتوں کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ فطرت اور مظاہر فطرت کی پرستش کا باب کھل جاتا ہے۔ شخصیت پرستی شرک تک جا پہنچتی ہے۔ رسوم پیچیدہ تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ خیال آرائی بڑھ جاتی ہے۔ یہ رویہ علوم و فنون کے لئے کوئی الگ بنیاد فراہم نہیں کرتا اس لئے یہاں بھی ادب کی بنیاد وہی ہوتی ہے جو خدا کو نہ ماننے والی سوسائٹی کے ادب کی

ایک اور مابعد الطبعی نظریہ یہ ہے جو زندگی سے فرار اور رہبانیت پر مبنی ہے۔ اسے ماننے والے دنیا کو دکھ درد بھری ہوئی سمجھ کر اس کی آلودگیوں سے کنارہ کشی کرنا چاہتے ہیں۔ اور زندگی کو عذاب سمجھتے ہیں۔ اور نفس کے مطالبات کو کچل کر روح کو مادی

کثافت سے پاک و منزہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ جبریت کے قائل نہیں جو کمزور قوتوں کو متہیج کرکے بھر زندگی کی جدوجہد میں حصہ لینے پر اکساتی ہے۔ قوت عمل اور بھی مفلوج ہو جاتی ہے۔ انہیں فلسفہ کی اصطلاح میں قنوطیت پسند کہہ سکتے ہیں۔ ان کے اس فرار سے سب سے بڑا فائدہ شر پسندوں کو پہنچتا ہے کیونکہ ایسے لوگوں کا ادب نیکوکاروں کو لب و عمل سے پیچھے ہٹانے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور دنیا کا میدان بدکاروں کے لئے صاف کرنا چاہتے۔

بعض لوگ ہمہ اوست (ہمہ از دست نہیں) کے قائل ہوتے ہیں۔ ان کا قیاس انہیں اس طرف لے جاتا ہے کہ انسان سمیت اس کائنات کی ہر شے غیر حقیقی ہے اور کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی۔ تمام موجودات ایک ہی وجود کا ظہور خارجی ہیں۔ اور دراصل موجود وہی ہے۔ باقی کچھ نہیں۔ نظریہ کی بنا پر انسان کو خود اپنی ہستی ہی میں شک ہو جاتا ہے۔ بھلا کہ وہ کوئی کام کرے یا پھر یہ طرز عمل ہوتا ہے۔ کہ خود کو مجبور محض کہہ کر اور اپنی غلطیوں کا ذمہ دار خدا کو ٹھہرا کر خواہشات اور مصلحت وقت کے دھاروں میں بہتا چلا جاتا ہے۔ یہ ذہنیت کچھ جاہلیت ہی تک محدود نہیں بلکہ اسلام میں بھی نفوذ کر گئی۔ اور صوفیا کے طبقے میں ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہوا جس کا مقصد احسان و تقویٰ کے ذریعہ حیات حاصل کرنا نہیں تھا۔ بلکہ دنیا کو دار العمل کے بجائے دار العذاب سمجھ کر فرار کی راہ ڈھونڈتا تھا۔ وحدت الوجود کی فلسفیانہ موشگافیوں اور مراقبوں نے انہیں بار تمدن اور بار خلافت اٹھانے کے قابل نہیں رکھا۔ شعر و ادب کا میدان جو تخیل کی ایک نہایت وسیع و عریض آماجگاہ ہے۔ ان کی موشگافی اور انہماک ذہنی کے لئے نہایت موزوں ثابت ہوا۔ چنانچہ اپنے ساتھ انہوں نے شعر و ادب کو بھی فرار اور رہبانیت اور بے عملی کے راستے پر ڈال دیا۔

ان سب نظریوں سے الگ اور مابعد الطبعی نظریہ یہ ہے جو انبیا کا پیش کردہ ہے یعنی یہ کائنات انسان سمیت کوئی اتفاقی ہنگامہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک منظم باضابطہ سلطنت ہے۔ اللہ نے ان کو بنایا ہے وہی اس کا مالک ہے اور وہی اس کا حاکم ہے انسان اس حاکم مطلق کے آگے سر تسلیم خم کرکے ہی اس ہمہ گیر نظام کے جزو کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے سکتا ہے اس کا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق زندگی بسر کرے۔ ہر انسان خدا کے سامنے جوابدہ ہے کسی کو اپنی مرضی سے اصول و ضوابط مقرر کرنے کا اختیار نہیں۔ یہ بنیادی نظریہ انسان کی انفرادی زندگی اس کے افکار و خیالات۔ علوم و فنون، شعر و ادب، سیاست و معاشرت، اخلاق غرض ہر شعبہ زندگی میں زبردست احساس ذمہ داری اور اخلاقی انضباط پیدا کرتا ہے۔ اس کا اجتماعی تصور اس بنا پر قائم ہوتا ہے کہ سب انسان ایک آدم کی اولاد ہیں۔ کسی کو کسی پر برتری نہیں۔ علوم و فنون اور شعر و ادب کے سلسلے میں اس کا نظریہ ایک بامقصد فن کار اور ادیب کا ہوتا ہے۔ جو اس زندگی سے یونہی گذر جانا نہیں چاہتا۔ بلکہ مفید کام کرنا چاہتا ہے (ملفوظات اقبال)

اس بحث و نظر سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ لوگوں میں ایک معین رائے اور مخصوص نظریہ پایا جاتا ہے جو مابعد الطبعی تصور پر قائم ہوتا ہے۔ ادبی مذاق۔ ادیب کا تخلیقی عمل اس کے اثر سے کبھی آزاد نہیں رہ سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ فروعی حیثیت سے کتنے ہی عوامل ہو سکتے ہیں، جن کے مجموعی اثر سے شخصیت کی تعمیر اور اجتماعات کی تشکیل ہوتی ہے۔ لیکن اگر دیکھا جائے کہ ان میں بنیادی حیثیت کس کو حاصل ہے تو صاف ظاہر ہو جائے گا۔ یہ حیثیت انسان کے نظریہ کائنات اور نظریہ زندگی ہی کو حاصل

ہے جو نتیجہ ہوتا ہے کسی نہ کسی مابعد الطبعی تصور کا یا دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ آدمی کے نظریات کی بنیاد عقیدے پر ہوتی ہے اور عمل کی بنیاد نظریات پر۔ اس لیے ایک بے عمل سے بے عمل اور باعمل سے باعمل آدمی پر عقیدہ کی کارفرمائی کسی نہ کسی انداز میں اپنا اثر دکھاتی ہے عقیدہ اور عمل میں جب توافق کی بجائے اختلاف ہوتا ہے تو جاہلیت پر اسلام کے دروازے کھل جاتے ہیں، اور وہ گھس آتی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے بیشتر لوگوں کے بارے میں یہ سوال درپیش ہے کہ ان کی اکثریت عیسائی عقیدہ پر ایمان رکھتی ہے یا نہیں۔ تو شاید اعداد و شمار کی ایک مہم سر کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ ولیسے ٹی ایس ایلیٹ نے مذہب اور ادب پر اپنے ایک مضمون میں اسی خیال سے استدلال کیا ہے کہ ان کی اکثریت کا عیسائی عقیدہ پر ایمان بطور مسلم ضرور ہے۔ چاہے اس پر عمل نہ ہو۔ ایشیا کے ممالک میں اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ ان کی تعلیم و تربیت ایک شدید مذہبی نظریہ رکھتی ہے جس کا اثر تاریخ، روایات کلچر اور ادب ہر چیز پر ظاہر ہے۔ ان حالات میں عقیدہ کو غلط قرار دے کر اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جدید ادب کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں عموماً اس اہم مخصوص نظریہ کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جدید ادب کی جڑیں لوگوں کے دلوں میں اتنی گہری نہیں جتنی کہ قدیم ادب کی جس میں ایسی غلطی نہیں پائی جاتی۔ ترقی پسند تحریک کا اپنا ایک عقیدہ تھا اس لئے وہ اس مذہبی نقطہ نظر کی مخالف تھی جس پر عوام ایمان رکھتے چنانچہ اس کی پہلی ضرب مذہبی نظریہ پر لگی۔ لیکن اس کے ردعمل سے گھبرا کر انہوں نے تقیہ کا مسلک اختیار کر لیا۔ اور کھلم کھلا مذہبی نظریہ کی مخالفت کی بجائے اپنے معتقین کے حلقے میں اس کی اشاعت پر اکتفا کیا یہیں سے ترقی پسندی اور غیر ترقی پسندی دونوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کا موقع ملا اور غیر ترقی پسندوں نے ترقی پسندوں کو سمجھنے میں ٹھوکر کھائی بقول ایک ترقی پسند نقاد ترقی پسند ادب نیا ادب ہو کر رہ گیا۔ ترقی پسندوں کے برخلاف نیاز فتحپوری نے اعلانیہ مخالفت کا مسلک اختیار کیا۔ انہوں نے عقیدہ کی جڑ دل کو عوام کے دلوں میں ہلا دینے کی ایک مہم زور و شور سے جاری کی لیکن کچھ عرصہ کے بعد جوش دھیما پڑ گیا۔ ان کا استدلال کچھ زیادہ دور تک ان کا ساتھ نہ دے سکا وہ جوابی تنقید سے لاجواب ہو کر خاموش ہو رہے اور یوں عوام کے دلوں میں مذہبی نظریہ برابر قائم رہا۔ مگر ان دو حلقوں سے زیادہ ایک اور چیز اثر انگیز ثابت ہوئی جو ایک مدت سے چپکے چپکے کام کر رہی تھی یہ مغربی تعلیم و تہذیب تھی جس کے اثر سے نامعلوم و غیر محسوس طور سے تعلیم یافتہ طبقہ کے معتدبہ حصے میں مذہب سے غفلت بڑھنے لگی۔ لیکن اسے کسی طرح بے زاری نہیں کہا جا سکتا بس یہی غفلت تھی جس کے سائے میں مسلمانوں میں ترقی پسند تحریک ہندوؤں سے زیادہ پھیلی۔[1]

لیکن مسلمانان ہند کی علمی و ادبی تاریخ ہمیشہ ایسی اصلاحی تحریکات کے اثر کی صفت پذیر رہی جن کا مقصد جزوی یا کلی طور پر عقیدہ و عمل کو غیر اسلامی عناصر کی آمیزش سے پاک کرنا اور دینی حس کو اس قدر بیدار کر دینا تھا کہ زندگی کے ہر ہر گوشے میں اس کے اثرات نمایاں ہو جائیں۔ چنانچہ شیخ احمد سرہندی اور ان کے بعد شاہ ولی اللہ اور ان کے نامور جانشینوں سے لے کر قیام پاکستان تک برابر چلا آتا رہا۔ اس بنیادی نظریہ کی جسے نظریہ حیات و کائنات کہنا چاہیئے۔ سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انسان کی فکری اور عملی

[1] کل ہند کانفرنس انجمن ترقی پسند معتقین منعقدہ الہ آباد ۱۹۵۳ء میں یہ مسئلہ زیر بحث آ چکا ہے کہ ترقی پسند تحریک مسلمانوں میں کیوں زیادہ پھیلی۔

کوششوں میں مقصد کی یگانگت پیدا کرتا ہے۔ ادب بحیثیت زندگی کے ہر شعبے میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے زندگی اور ادب کے فلسفیانہ پس منظر کی وضاحت اس سے ہوتی ہے گویا یہ ایک وجہ اشتراک ہے زندگی اور ادب کے لئے اس اشتراک کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک کا تعلق ادیب اور فنکار کے مذہبی و ادبی تصورات میں نفیس انسانی شعوری و غیر شعوری عناصر اور اس کی نفسی زندگی سے ہے دوسرے کا تعلق انسان کی عملی زندگی تنقید اور انسانوں کے باہم روابط اور تعلقات سے جنہیں اخلاقی معاملات کہا جاتا ہے۔

انسان کے علمی و ادبی مذاق اور ذہنی ترقی پر بیک وقت بہت سی چیزوں کا اثر پڑتا ہے ماحول کے اثرات سے لے کر فرد کی نفسیات تک ہر جگہ کتنے ہی عوامل ہیں جن کے مجموعی اثر سے شخصیت کی تعمیر اور اجتماعات کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس پیچیدگی کو سمجھنے اور تجزیہ و تحلیل کرنے کے سلسلے میں سب سے پہلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان عوامل میں بنیادی حیثیت کس کو حاصل ہے کس کے زیر اثر سب ایک سمت میں کار فرما ہوتے ہیں سب سے پہلے شخصیت کی تعمیر ہی کو لیجیئے شخصیت کی تعمیر محتاج ہے عقلی جمالیاتی۔ اخلاقی اور دیگر نفسی عناصر کی تاریخ کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہر قوم میں شخصیت کی تعمیر کے لئے بعض نفسی عناصر پر ترجیح دی جاتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ملک کی شخصی خصوصیات میں ایرانیوں نے جمالیاتی عنصر کو اولیت کا مقام دیا ہے چین اور بدھ مت اور دیگر مذاہب سکون اور عافیت پسندی پر زور دیتے رہے ہیں۔ عربوں میں چند اخلاقی خوبیاں شجاعت۔ مہمان نوازی وغیرہ ہی سب کچھ تھیں شخصیت کا عنصر ان قوموں کے شعر و ادب اور فنون لطیفہ میں نمایاں ہے۔ ایرانیوں کی شاعری میں جمالیاتی عنصر چھایا ہوا ہے ہندو لٹریچر شانتی ہی شانتی ہے گرمئی حیات معدوم ہے۔ عربوں میں جاہلی، شاعری شجاعت، مہمان نوازی اور ایسے ہی چند اوصاف کی شاعری ہے۔ اسلام نے شخصیت کی تعمیر کے لئے ان سب عناصر نفس کو ایک چیز یعنی طاقت الٰہی میں جمع کر دیا ہے[۱]۔ اس طرح عقل جمالیاتی، اخلاقی اور دیگر تمام نفس کی تہہ میں اسلام کی نظریہ حیات و کائنات کی روح کارفرما ہوئی اور شخصیت کی تعمیر میں دینی عنصر کو اولین اہمیت حاصل ہوگئی۔ دینی حس درحقیقت نفس انسان کی مجموعی واجدانی کیفیت ہے جو ہمارے تمام عناصر نفس کی تہہ میں کارفرما ہوتی ہے۔ وہ عقلی جمالیاتی۔ اخلاقی۔ وجدانی۔ روحانی اور دیگر عناصر کی مخالفت نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک کو دوسرے سے برسر پیکار ہونے سے روکنے والی اور نفسی زندگی میں توافق اور ہم آہنگی پیدا کرنے والی ہے۔ انسان اپنی عقل سے کام لے کر چند استدلال قائم کرتا ہے۔ بظاہر ان میں کوئی منطقی تضاد نہیں ہوتا لیکن وہ خود اس کی اپنی شخصیت کے دوسرے عناصر سے ہم آہنگ نہیں ہوتے یا دوسروں کے لئے ناقابل قبول اور مضرت رساں ہوتے ہیں۔ وہ اپنے جمالیاتی ذوق سے کام لے کر چند ایسے جمالیاتی تصورات قائم کرتا ہے جو بظاہر دلپذیر اور حسن کا نمونہ معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ صرف اس کے اجتماعی نصب العین کو نقصان پہنچانے والے ہوتے ہیں بلکہ خود اس کی شخصیت کی تعمیر کی جڑیں ہلانے والے ہوتے ہیں۔ ایسے عقلی استدلالات اور جمالیاتی کی تباہ کاری سے بچنے یا اُن کے نقصان دہ پہلو پر قابو پانے کے لئے اسی بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ انہیں ایک وحدت اور ایک مقصد کے تحت لایا جائے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان ایک خاص جماعتی نصب العین حاصل کرنا چاہتا ہے

[۱] علامہ اقبال کے تصور شخصیت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

معیشت اور سیاست کا جو نظام اس کے پیش نظر ہوتا ہے اسے حاصل کرنے کے لئے اپنی شخصیت کی تعمیر کے سوال کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور اس طرح اس کے شعوری و غیر شعوری عناصر نفسی کے تقاضے تشنۂ تکمیل رہ جاتے ہیں نفسی زندگی میں انتشار برپا ہو جاتا ہے اور اس وقت خارجی مظاہر کی تحریک کے علاوہ کوئی ایسی داخلی تحریک اس کے لئے باقی نہیں رہتی جو اس کے شعر و ادب کی روح بن گئی۔ شخصیت کے تصور سے مارکس نقادوں کے انحراف کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ نفسی عناصر میں وجہ اشتراک ایسے نظریہ کو نہیں ٹھہراتے جو حیاتی اور غیر حیاتی دونوں مظاہر میں توازن لئے ہوئے ہو. حالانکہ ان میں اشتراک ایک ایسا ہی تصور پیدا کر سکتا ہے جو شعوری و غیر شعوری دونوں قسم کے عناصر نفس پر حاوی ہو. ایسا تصور خارجی اور مادی نہیں ہو سکتا بلکہ ماورائے عقل ہی ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں شخصیت کے تصور کی نفی کی جاتی ہے۔

غرض کہ ہماری نفسی زندگی کے منتشر عناصر کو ایک ایسا مذہبی تصور اطاعت الٰہی کا تصور ہے اس کی سرحد اگر ایک طرف نفس انسانی سے ملتی ہے تو دوسری طرف انسانی تمدن سے یعنی انفرادیت اور اجتماعیت دونوں پر حاوی ہے۔ ایک شاعر اور ادیب کا تخلیقی عمل درحقیقت اس کی نفسی زندگی کے مختلف عناصر کا عمل ہوتا ہے جسے وہ جماعتی اور شخصی نصب العین حاصل کرنے کے لئے کرنا چاہتا ہے ایک سچا مذہب اس کے سامنے ایک بلند نصب العین بھی رکھتا ہے اور اس شخصیت کی تعمیر کے لئے تعمیری بنیاد بھی فراہم کرتا ہے۔ اسلامی عقائد میں انسان کی نفسی زندگی کے مختلف عناصر کو ہم آہنگ کرنے کی زبردست طاقت موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسلام ایک اجتماعی نصب العین کے حصول کی جد و جہد کے لئے بھی تیار کرتا ہے یہی دو چیزیں ہیں جو تخلیقی عمل میں وحدت ہم آہنگی اور اجتماعی روح پیدا کرتی ہے. یہ تخلیقی عمل خالص ذہنی اور نفسیاتی عمل ہے ہر ادیب اور فنکار غیر معمولی طور پر ذکی الحس ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کا دل اور دماغ مختلف اثرات قبول کرتا رہتا ہے پھر ان مجتمع تاثرات کو ایک خاص انداز سے نظم و ترتیب کا جامہ پہناتا ہے اس اعلیٰ فعل کے پیچھے کوئی نہ کوئی جذبہ کارفرما ہوتا ہے یہی جذبہ قاری یا سامع پر دوبارہ پیدا کر دیتا ہے۔ تخلیق کی سب سے بڑی کامیابی ہے. ادب کے اس نفسیاتی عمل کا منشا دراصل یہ ہوتا ہے کہ ایک نفسیاتی مقصد حاصل ہو مثلاً جنسی ادب کے علمبردار ادیب کا نفسیاتی مقصد یہ ہوتا ہے کہ جمال فطرت یا واقعات زندگی کی عکاسی سے ذہن تلذذ کی طرف اسی طرح راجع ہو. جیسے خود اس کا ذہن راجع ہوتا ہے ایک مارکسی ادیب ان مظاہرۂ کائنات اور واقعات سے زندگی کی عکاسی سے انسان کے طبقاتی شعور کو اس طرح ابھارنا چاہتا ہے جس طرح اس میں خود طبقاتی شعور ہوتا ہے. ایک تصوریت پسند تاثرات و فکر کی ترتیب اور تنظیم کچھ ایسے طریقے پر کرتا ہے کہ پڑھنے والا ہر شے میں اس طرح کھو جائے مادی اشیا بھی اسے ماورائی محسوس ہونے لگیں اس پر غنودگی طاری ہو جائے اور اس طرح مسائل حیات کی طرف سے توحش پیدا ہو جاتے جیسا کہ خود اس میں یہ سب باتیں موجود ہوتی ہیں. فرائڈ کی تحلیل نفسی پر ایمان رکھنے والا ادیب تمام احساسات و افکار کو سفلی جبلتوں کے تابع سمجھتا ہے اس کے نزدیک تمدن، اخلاقی اور جمالیاتی احساسات بھی اس کے وحشیانہ جذبات کی کارفرمائیاں ہیں. چنانچہ معاشرے کے گھناؤنے رخ ہی کو اپنی خیال آرائی کا مرکز قرار دیتا ہے اور اپنے پڑھنے والوں میں بھی اسی طرز فکر کا بیج بونا چاہتا ہے. بعض لوگوں میں قنوطیت پائی جاتی

ہے جوان کے احساسات اور ان کی نفسی زندگی پر اس درجہ غالب ہوتی ہے کہ وہ شاید خود کو بھی بنیادی دشمن سمجھنے لگتے ہیں۔ یہی صورت ان کی تحقیقات میں پائی جاتی ہے وہ اپنے ساتھ ساتھ اپنے پڑھنے والوں کو بھی نفسیاتی لحاظ سے ذہن اک اور انسانیت دشمن بنانا چاہتے ہیں قطع نظر اس بات سے کہ وہ کہاں تک درست ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سب صورتوں میں ایک نفسیاتی مقصد ہوتا ہے اسے مبنی بر حقیقت ثابت کرنے کے لئے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اسے زندگی کے حقائق اور نفسیات انسانی کی تہہ میں بنیادی اہمیت حاصل ہے یا نہیں اور اس سے زندگی کی تعمیر ہوتی ہے یا تخریب۔

اس طرح جوبات نفسیات سے چلی تھی وہ نظریہ زندگی، مقصد ہستی اور بالآخر مذہب تک پہنچ گئی ہے۔ مذہب انسان کے لئے مقصد زندگی اور زندگی کا ایک عمل پیش کرتا ہے جو فلسفہ حیات، خارجی قوانین اور مکمل طور سے مادیت پر مبنی ہوتا ہے۔ اور نفسی زندگی کے انتشار کو دور کرتی ہے خلاصہ یہ ہے کہ ایک ادیب کا ذہنی عمل انتشار اور عدم توازن سے اسی صورت میں بچ سکتا ہے جبکہ انسانی وجود اور عالم موجودات کا ایک نہایت بلند اور برتر مقصد اور اس کائنات کی فرمانروا ہستی کا ایک نہایت اعلیٰ تصور ذہنوں میں پیوست ہو جو تاثرات اور افکار کو ہم آہنگ کرنے اور عناصر نفسی میں وحدت قائم رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اخلاق سے مراد باہم مخلوق حزا کے حقوق و فرائض کے وہ تعلقات ہیں جن کو ادا کرنا انسان کے لئے مناسب بلکہ ضروری ہے اخلاق کا اجتماعی پہلو اس سے واضح ہے کہ سوسائیٹی کا قیام و بقا اس کے بغیر ناممکن ہے! انسان کی اخلاقی زندگی کا آغاز اسی وقت سے ہوجاتا ہے جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ ہیت اجتماعی کے وسیع تر اغراض و مقاصد کے مقابلے میں اسے اپنی انفرادی اغراض اور ذاتی خواہشات کو ذیلی حیثیت دینی چاہیئے اور اس کا انفرادی پہلو یہ ہے کہ فرد بحیثیت فرد جذبات اور خواہشات کا ایک مجموعہ ہوتا ہے۔ حیوانوں کے برخلاف انسان اپنے جذبات و خواہشات کا نہیں بلکہ ہر جداگانہ خواہش کا جذبہ بن سکتا ہے پھر جب اجتماعی ضروریات کے تقاضے اسے اپنی توانائیوں کا ایک حصہ دوسرے کے لئے صرف کرنے پر مجبور کرتے ہیں تو اس کے اندر ایک اخلاقی کشمکش سے ہر شخص دوچار ہوتا ہے ایک فنکار کے تخلیقی عمل کے نتائج اس کی اخلاقی کشمکش کا مظہر ہوتے ہیں پھر چونکہ اس عمل سے ادیب اور فنکار کا منشا جذبات و خواہشات کی وقتی تکمیل ہی نہیں ہوتا۔ وہ اس کے تاثرات کو مستقل دیکھنا چاہتا ہے! اور آئندہ زمانہ پر بھی نظر رکھتا ہے۔ برائی اور اچھائی کا خیال ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔ اور ہمیشہ اخلاقی خوبیوں کو سراہا گیا ہے! لیکن بالعموم اخلاق کے اجتماعی پہلو کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے مثلاً ایک شخص انفرادی طور سے اخلاقی اصولوں کا پابند ہو لیکن اپنے گروہ اپنے قبیلے! اپنی قوم کے لئے دوسرے گروہ، قبیلے یا قوم پر ظلم کو روا سمجھتا ہو اس لئے یہ ضروری ہے کہ خیر و شر کا ایک ایسا تصور ہو جس میں تمام انسانیت کی بھلائی ہو۔

اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ مادہ پرستوں کی طرح بغیر کسی مابعد الطبعی تصور کے انسانی زندگی کے تمام تعلقات میں خواہ وہ شخصی ہوں یا اجتماعی اخلاق کی انتہائی اہمیت پر زور دیا جائے لیکن اس صورت میں اخلاقی حدود کا تعین خود افراد و اقوام اپنی اپنی خواہشات اور اغراض کے تحت کریں گی۔ کانٹ فرض برائے فرض پر زور دیتا ہے لیکن فرض ایک مبہم اصطلاح ہے جس کی تشریح میں خواہشات اور اغراض کا شامل ہو جانا لازمی ہے۔ یہی صورت فلسفہ و اخلاق کے دوسرے سکولوں کے پیش کئے۔

ہوئے نظریوں کی بھی ہے۔ ان سب سے الگ صورت یہ بھی ہے کہ بظاہر اخلاق کا وہ تصور اپنائیں جس کی بنیاد خدا پرستی ہے خدا کا، قانون کسی ایک شخص۔ گروہ یا قوم کے ساتھ خاص نہیں ہوتا بلکہ اس کی بنیاد کل بنی نوع انسان کی بھلائی ہوتی ہے۔ مذاہب کے علاوہ زندگی کے جتنے نظامات بھی ہیں ان میں یہ بنیادی شرط پوری نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان نظاموں میں اخلاق کا تصور کمزور ہونے کی وجہ سے بنیادی اہمیت اخلاق کو نہیں دی جاتی۔ بلکہ زندگی کے دوسرے کم اہم عناصر کو فیصلہ کن عنصر قرار دیا جاتا ہے ان کے زیر اثر تخلیق ہونے والے ادب میں بھی یہی صورت جھلکتی ہے اس کے برخلاف مذہب میں اہم ترین حیثیت اخلاق کی ہوتی ہے اور اس کے لٹریچر میں غالب عنصر اخلاق کا ہوتا ہے۔

ایک اشتراکی ادیب اور فنکار کے نزدیک اقتصادی عنصر ہی زندگی میں فیصلہ کن قوت ہے اقتصادی اونچ نیچ کے علاوہ زندگی کی دوسری خرابیاں مثلاً سیاسی قوتوں کا ٹکراؤ چور کا چوری کرنا زانی سے زنا کا فعل سرزد ہونا یہ سب اور اسی طرح کے دوسرے جرائم ان کے نزدیک اقتصادی بدحالی کی وجہ سے ہیں اقتصادی عنصر ہی ان کے نزدیک اصل جزو ہے۔ اخلاق کوئی چیز نہیں۔ لیکن دیکھا جائے تو بالکل غلط ہے۔ اگر معاشی بدحالی خرابیوں کا سبب ہوتی ہے تو خوش حال طبقے کا اخلاق بہتر ہوتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سرمایہ دار لوٹ کھسوٹ میں مبتلا ہوتا ہے اور جنس گھٹن کچھ غریب طبقہ تک محدود نہیں علاوہ ازیں یہ سوال کیا جاتا کہ اشتراکیت کے حامی ادیبوں کو لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقے سے نفرت کیوں ہے اور اس کو مزدور طبقہ سے ہمدردی کیوں کیا اس نفرت اور ہمدردی کا محرک انصاف کا جذبہ نہیں ہوتا۔ لوٹ کھسوٹ مچانے والے طبقہ کو انسانیت کا دشمن کیوں کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے پیچھے انسانیت کا احترام ہوگا۔ اور یہ نظام اخلاق کے تحت آتا ہے۔

اسی طرح جو ادیب جنسی گھٹن کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں وہ آخر ایسا کیوں کرتے ہیں کیوں ایسے افراد سے ہمدردی کا جذبہ ہوتا ہے جن کی زندگی جنسی لحاظ سے ناآسودہ اور ناہموار ہے اور کیوں وہ ان لوگوں کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں جو اس گھٹن کا سبب ہیں تو کیا اس محرک میں انصاف ہی جذبہ نہیں۔

اس تجربہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اصل جذبہ انسانی بھلائی کا جذبہ ہے جو ہر سوسائٹی اور ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں ملتا ہے ایک اچھی سوسائٹی میں یہ جذبہ اچھی شکل میں ملتا ہے اور بری سوسائٹی میں اسی پر غلط توجیہات کے پردے پڑے معلوم ہوتے ہیں اس سے ادب اور زندگی میں اخلاقی رجحانات کا بنیادی طور پر اہم ہونا واضح ہوتا ہے مذہب ادب کا مقصد متعین کرتا ہے وہ ذہن میں اخلاقی حس کو بیدار کرے۔ یہی وہ بنیادی چیز ہے جو واقعات زندگی اور جمال فطرت کی عکاسی میں جذب ہو کر ادب کو تعمیر کی راہ پر لے جاتی ہے۔ دوسرے نظریوں کے ماننے والے اور ادب و مذہب کے اخلاقی تعلق کا انکار کرنے والے بھی درحقیقت اس کی بنیاد پر اپنی روش کو برحق مانتے ہیں مگر انہیں یا تو اس کا واضح شعور نہیں ہوتا یا وہ جان بوجھ کر اس کا انکار کرتے ہیں اور تضاد کا شکار ہو جاتے ہیں ایک مارکسی ادیب مزدور طبقے کی مظلومی کے اظہار سے اپنے پڑھنے والوں کی ہمدردی اور اخلاقی حمایت حاصل کرتا ہے اور ادب کے مقصد تک اخلاقی اوصاف کو ابھار کر ہی پہنچتا ہے لیکن وہ پھر بھی اسے،

اقتصادی کہتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک اخلاقی وصف کو تحریک دینے کے لئے کتنی ہی غیر اخلاقی راہوں سے سامنے آتا ہے علاوہ مظلوم طبقے سے ہمدردی ہی پر نہ دہ نہیں دیتا اور اس کے خلاف تخریبی راہوں کو اپنانے میں کوئی پس و پیش نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے ادب کی بنیاد محبت سے زیادہ نفرت پر قائم ہوتی ہے اور اس کے اثرات میں منفی پہلو ہمیشہ نمایاں رہتا ہے۔

مذہب بھی مظلوم طبقے سے ہمدردی رکھتا ہے۔ ہر مذہب کا مقصد کچلے ہوئے اور پسماندہ طبقوں کو اوپر اٹھانا اور ہر انسان کو انسانیت کے معیار پر لانا ہے۔ اسلام انسانیت کو ظلم کے نیچے سے چھڑا کر آزاد فضا میں لانا چاہتا ہے کچلے ہوئے طبقوں کو زندگی کی نعمتوں سے مالا مال کرنے کی کوشش اس کا اولین مقصد ہے لیکن اس کا انداز تخریبی نہیں۔ ہر حال میں اخلاقی حدود کو ملحوظ رکھنے کا قائل ہے جو معاشرے کی تعمیر کے لئے ضروری ہیں۔ خواہ وہ مظلوم کی حمایت ہو یا ظالم سے بے زاری یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر ادبی تخلیقات میں مذہب کے اثرات کو ممیز کر سکتے ہیں اور یہ سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب میں اخلاقی نقطۂ نظر کیوں ضروری ہے۔

ادب اور اخلاق کے اس تعلق کو ہر دور میں اہمیت حاصل رہی ہے بجز موجودہ کے جس میں کچھ لوگوں کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ اخلاقی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے ناقابل قبول ہیں اس اعتراض کی تردید میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ یہاں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوگا کہ قدروں کے بدل جانے کا یہ مفہوم کہ اخلاقی ضابطوں میں معاشرے کو فیض پہنچانے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے خلاف حقیقت ہے ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ حالات کی ناسازگاری اور ماحول کے ناخوشگوار تغیر سے جب کسی معاشرے کی قوت انجذاب مفلوج ہو جاتی ہے تو وہ اخلاقی قوانین کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیتا ہے ایسی صورت میں تو معاشرے میں انقلاب لانے اور خوشگوار تغیر پیدا کرنے کا مطالبہ کرنا چاہیئے نہ یہ کہ ہم اخلاقی اصولوں کو ناقابل قبول سمجھنے لگیں۔ یوں تو اخلاق کا ایک تصور اردو ادب میں ہر زمانے میں موجود رہا ہے لیکن اسلام جس تصور اخلاق کو پیش کرتا ہے وہ صرف انفرادی پہلو تک محدود نہیں۔ بلکہ اس کا رخ اجتماعیت بھی ہے۔ اردو ادب پر اسلامی تحریکات کے زیر اثر ادب میں اجتماعی نقطۂ نظر سے مسائل کو دیکھنے کی کوشش ملتی ہے۔ اور اخلاقی احساس کو انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ اجتماعی شعور سے ہم آہنگ کر کے حالات و واقعات کی عکاسی کی گئی ہے۔

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی

ادب کا اسلامی نظریہ

محققین زبان کے مطابق لفظ ادب کا قدیم ترین مفہوم عادت، طرزِ عمل، دستور یا معیار ہے جس میں قابلِ ستائش ہونے اور آبا و اجداد سے ورثے میں پانے کا مفہوم بھی شامل ہے اسی مفہوم نے ارتقا پایا تو ادب کا لفظ حسن تربیت، شائستگی وخوش خلقی یعنی معاشرتی واخلاقی صفات حسنہ کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ پھر آگے چل کر یہ لفظ اس مجموعی علم کے لیے بولا جانے لگا جس سے کوئی شائستہ و مہذب بنتا ہے اس میں شعر و شاعری، خطابت، بلاغت، نحو، عروض اور قدیم عرب کی قبائلی و تاریخی روایات کا علم شامل سمجھا جاتا تھا۔ ادب کا یہ تصور پہلے تو صرف عرب ثقافت کے شاعرانہ تاریخی اور باستانی پہلوؤں تک محدود رہا لیکن بعد میں اس کا دائرہ وسیع ہو گیا اور اس میں غیر عرب ثقافتوں کا علم بھی شامل ہو گیا، پھر اس وسیع مفہوم میں تجدید پیدا ہوئی اور اس کا اطلاق محض شعر و سخن، نثرِ مرصع، حکایات و نوادر نگاری اور اسی قبیل کی چیزوں پر کیا جانے لگا۔ اور آج کل لفظ ادب، انگریزی لفظ لٹریچر کے مرادف کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور یہی مفہوم آج کی اس گفتگو میں راقم الحروف کے پیش نظر ہے۔

لٹریچر یعنی ادب اپنے موجودہ مفہوم میں ان تحریروں کو کہتے ہیں جن کی قدر و قیمت کا انحصار ہیئت و اظہار کے حسن کے ساتھ ساتھ جذباتی و تخیلی تاثیر پر ہو۔ ایسی تحریروں کا اثر محض انبساطِ خاطر یا تفریح نفس بھی ہو سکتا ہے اور اس کے آگے بڑھ کر کشادگی روح و لطیریتِ نظر بھی اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اصلاحِ فکر و تزکیہ نفس اور تحریک عمل بھی۔ ادب کے مختلف نظریے اس کے اثر کی نوعیت ہی کو پیش نظر رکھ کر وضع کئے گئے ہیں۔ ادب برائے ادب کے نظریے کے مطابق ادبی تخلیقات کا مقصد انبساطِ خاطر کے سوا اور کچھ نہیں اور یہ حسن آفرینی کے ذریعے ممکن ہے اور حسن وہ ہے جو ذوق نظر کو تسکین دے اور حظ بخشے۔ اس نظریے کی رو سے ادبی تخلیقات کا مقصد سوائے حسن آفرینی کے اور کچھ نہیں کیونکہ اس نظریے کے علمبرداروں کے نزدیک، حسن بذاتہٖ ایک ایسی قدر ہے جو مطلق ہے اور ہر دوسری قدر سے اعلیٰ اور برتر ہے حتیٰ کہ خیر اور صداقت کی قدروں سے بھی۔

اسلامی نقطہ نظر سے یہ رویہ صحیح نہیں قرآن مجید کی رُو سے کائنات کی ہر چیز انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے مثلاً سورۃ لقمٰن میں آیا ہے۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً وَّبَاطِنَۃً (آیت ۲۰)

(کیا تم لوگوں کو یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ اللہ نے تمام چیزوں کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے

اور جو کچھ زمین میں ہے اور اس نے تم پر اپنی نعمتیں ظاہری اور باطنی پوری کر رکھی ہیں۔

اسی طرح سورہ الجاثیہ میں آیا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (آیت ۱۳)

(اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں اُن سب کو تمہارے لئے مسخر بنایا) اور انسان کی تخلیق کا مقصد قرآن مجید نے خدمت الٰہی قرار دیا ہے، سورۃ الذٰریٰت میں آیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (آیت ۵۶)

(اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری خدمت و عبادت کریں) اور اللہ کی خدمت و عبادت کا بہترین طریقہ ہے انسانیت کی خدمت۔ انسان کی تمام سرگرمیاں جن میں تمام جمالیاتی و ادبی سرگرمیاں بھی شامل ہیں سب کی جہت یہی ہونی چاہیئے یعنی انسانی زندگی کو بہتر، بلندتر، لطیف تر، پاکیزہ تر اور خوب تر بنانا اور بدصورتی وزشتی شر و باطل، درد و الم اور رنج و حزن سے پاک کرنا۔ لہٰذا جمالیاتی و ادبی سرگرمی اپنی غایت آپ نہیں ہے بلکہ انسان اور انسانیت کی خدمت کے لئے ہے۔ فن لطیف ہو کہ ادب، وہ فن یا ادب کہلاتا ہی اُسی وقت ہے جبکہ اس کے اظہار میں حسن ہو اور وہ جمالیاتی حظ بخشتا ہو لیکن حظ بخشی اگر اس کا مقصد وحید بن جائے تو یہ بات اسلامی نقطۂ نظر سے درست نہیں کہ ہر انسانی فعل ہر انسانی سرگرمی کی سمت متعین کردی گئی ہے اور وہ ہے خدمت الٰہی جس کی بہترین شکل ہے خدمت انسانیت۔ یہ سچ ہے کہ انسانی زندگی کو خوشیوں سے مالا مال کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ حسین و جمیل چیزیں تخلیق کی جائیں جو جمالیاتی حظ فراہم کریں۔ لیکن جمالیاتی حظ مقصود بالذات بن جاتے تو انسان کو خدا فراموش اور انسانیت فراموش کر دیتا ہے لذتیت کا دلدادہ بنا دیتا ہے، بدی کی راہ پر ڈال دیتا ہے۔ اس لئے اسلام ایسی جمالیاتی یا ادبی تخلیق کا دلدادہ نہیں جس کا مقصود محض حظ بخشی ہو۔ مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ایک حدیث ملتی ہے کہ

اِمْرُؤُ الْقَيْسِ صَاحِبُ لِوَاءِ الشُّعَرَاءِ اِلَى النَّارِ (یعنی) امرءالقیس دوزخ کی طرف جانے میں شعراء کا علمبردار یعنی قائد ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے امرءالقیس کے بارے میں یہ کیوں کہا؟ اس لئے کہ جب ہم امرءالقیس کے کلام پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس میں حسن و عشق کی داستانوں عورت اور شراب کی تعریفوں، برباد ویران شہروں کے آثار اور سنسان ریتیلے ویرانوں کے مناظر و مراثی کے نقشے ملتے ہیں اس کلام کی زبان و بیان، اسلوب و انداز اور ہیئت و اظہار کے حسن و دلکشی میں کسی کو کلام نہیں لیکن جہاں تک اس کے مضامین و موضوعات اور قارئین پر اس کے اثر کا تعلق ہے اس کی نوعیت ایسی ہے کہ حضورؐ نے اس کے مصنف کو جہنم کی طرف جانے والے شاعروں کا سردار قرار دیا ہے، امرءالقیس نے زبان و بیان پر اپنی قدرت اور اپنی تخلیقی و تخیلی استعداد کو جس طرح اور جن موضوعات پر صرف کیا ہے اس

سے قارئین کو بلند مقاصد اور اعلیٰ عمل کی تحریک قطعاً نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس سُکر و خود فراموشی یا حیاتی لذتوں میں غرق ہو جانے کی تحریک ہوتی ہے۔ اس بنا پر ایسے جہنمی شاعروں کا قائد قرار دیا گیا ہے اس سے یہ نکتہ کھل کر سامنے آتا ہے کہ کسی فنی یا ادبی تخلیق کی اہمیت اور قدر و قیمت اس کے فنی و ادبی حسن ہی سے متعین نہیں ہوتی بلکہ اس کے مضامین و معانی کی حیات بخشی و حیات افروزی کی خاصیت سے متعین ہوتی ہے۔ الاغانی لابی الفرج (جلد ۸) میں حضرت ابن عائشہ سے مروی ایک حدیث ملتی ہے۔

عَن ابن عائشہ قَالَ۔ اُنْشِدَ النبیؐ قَوْلَ عَنْتَرَۃَ۔ وَلَقَدْ اَبِیْتُ عَلَی الطَّوٰی وَاَظَلُّہٗ حَتّٰی اَنَالَ بِہٖ کَرِیْمَ الْمَاکَلِ فَقَالَ صلی اللہ علیہ وسلم مَا وُصِفَ لِی اَعْرَابِیٌّ قَطُّ فَاَحْبَبْتُ اَنْ اَرَاہُ اِلَّا عَنْتَرَہ۔

یعنی حضورؐ کو عنترہ کا یہ شعر سنایا گیا کہ میں رات اور دن بھوکا رہنے کو تیار ہوں تاکہ محنت مشقت کے ذریعے عزت کی روزی حاصل کر لوں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوقِ ملاقات نہیں پیدا کیا سوائے عنترہ کے۔ حضورؐ کا ردِ عمل اس شعر کے بارے میں اس قدر خوشگوار کیوں تھا اس لئے کہ شاعر اس شعر میں کشمکشِ حیات میں محنت و مشقت و جائز ذرائع کے ساتھ کامیابی حاصل کرنے کا عزم ظاہر کر دیا ہے یہ شعر صحت مند و صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی، بولتی چالتی تصویر ہے اس طرح مزید واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ادب اپنی غایت آپ نہیں ہے اور نہ اُس کا مقصد محض حظ آفرینی ہے بلکہ ادب زندگی کا تابع ہے، زندگی کا خادم ہے اس کی قدر و قیمت اور اہمیت زندگی، انسان اور انسانی معاشرے کے حوالے سے ہی متعین ہوتی ہے اسلام کی رو سے ادب کا مقصد ہے زندگی کے بہترین اور بلند ترین اقدار و افکار و جذبات کو قارئین تک ایسے حسین و موثر انداز میں پہنچانا کہ وہ نہ صرف ان سے محظوظ و مسرور ہوں بلکہ انہیں عملِ صالح کی تحریک و تشویق ہو وہ اس راستے پر چلنے کی طرف مائل ہوں جسے، قرآن مجید نے صراطِ مستقیم قرار دیا ہے۔ بالفاظ دیگر ادب کی سحرکاری کا استعمال اچھے انسان اور اچھا معاشرہ پیدا کرنے کے لئے ہونا چاہیئے ادب کی حظ بخشی کی خصوصیت انسانوں کو صحیح راستے پر چلانے کے لئے عقل و معرفت کی، ایک مفید رفیق ہونی چاہیئے۔

یہ عام طور پر تسلیم ہے کہ ادب کی لطیف ترین اور بہترین صورت شاعری ہے اب بعض لوگ اس مغالطے میں خود بھی مبتلا ہیں اور دوسروں کو بھی مبتلا کر دیتے ہیں کہ اسلام کی رو سے شاعری ایک مذموم و مکروہ فن ہے اس کے ثبوت میں وہ کلام مجید سے بعض آیتیں پیش کرتے ہیں مثلاً سورۃ یٰس کی آیت ۶۹ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِیْ لَهٗ (ہم نے ان کو یعنی پیغمبرؐ کو شعر گوئی نہیں سکھائی اور نہ وہ ان کو شایاں ہے، اسی طرح سورہ شعرا کی آیات ۲۲۴ تا ۲۲۶، وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ۔ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ (اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سر مارتے پھرتے ہیں اور کہتے وہ ہیں جو کرتے نہیں)۔ اسی طرح سورہ الحاقہ کی آیات ۴۰، ۴۱

إِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۔ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ، قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ

(بے شک یہ ایک بزرگ قاصد کا کلام ہے، کسی شاعر کا نہیں، تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔)

اب اگر ان تمام آیات کو ان کے سیاق و سباق میں دیکھا جائے اور شعر و شاعری کے جو تصورات عہد نبوی میں اہل عرب میں رائج تھے اُن پر نظر رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ شاعری کی بنفسہٖ مذمت نہیں کی گئی ہے بلکہ بُری شاعری اور بُرے شاعروں کی مذمت کی گئی ہے۔ اگر شاعری بنفسہٖ مذموم و مکروہ یا ممنوع ہوتی تو نہ حضرت حسانؓ بن ثابت کو حضورؐ مشرکین کی منظوم ہجوؤں کا جواب دینے کا حکم دیتے نہ حضرت کعبؓ بن مالک اور حضرت عبداللہ بن رواحہ کی شاعری کو بنظر استحسان دیکھتے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں عربوں کے شعور عامہ میں شاعری کا مطلب تھا کلام موزوں جس میں حیرت انگیز طلسماتی قصے، حسن و عشق کی رومانی داستانیں، شراب، عورت، اسلحہ، اونٹوں اور گھوڑوں کی تعریفیں، عسکری مہارت و شجاعت کی تصویریں ہوں اور مختلف قبیلوں یا شاعروں کی اپنی بڑائیوں کا تعلی آمیز بیان کیا گیا ہو۔ ظاہر ہے نہ تو قرآن مجید شاعری کے اس تصور سے مطابقت رکھتا ہے اور نہ آنحضرتؐ شاعر تھے جب اللہ تعالیٰ نے یہ کہا کہ ہم نے پیغمبر کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ وہ ان کو شایان ہے تو یہ دراصل کفار قریش کے اس خیال یا طعنے کے جواب میں کہا کہ وہ رسول اکرمؐ اور قرآن مجید کو عہد جاہلیت کے کاہنوں اور شاعروں کی سطح پر لاکر نبوت کا رتبہ گھٹانا چاہتے تھے۔ سورہ شعراء میں ان شاعروں کی مذمت کی گئی ہے جو ہر وادی میں سر مارتے پھرتے ہیں اور کہتے وہ ہیں جو کرتے نہیں اس کے بعد ہی استثنائی آیت ہے کہ

إِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا

(سوائے ان کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے اور کثرت سے اللہ کا ذکر کریں)

گویا بُرے شاعر اور اچھے شاعر کا فرق واضح کر دیا گیا ہے اگر شاعری بنفسہٖ بُری ہوتی تو حضورؐ یہ بھی ہرگز نہ فرماتے کہ إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ سِحْرًا وَّإِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِكْمَةً یعنی بے شک بیان میں جادو ہے اور شعر میں حکمت۔ یہ حدیث حضرت ابن عباس سے مروی ہے اور داؤد کے مستند مجموعہ احادیث میں ملتی ہے۔ قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں اچھی اور بری شاعری میں فرق کرنا مشکل نہیں۔ اچھی شاعری وہ ہے جس کا سرچشمہ ایمان سے معمور دل ہو۔ جو اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت کو نمایاں کرے جو دانائی اور حکمت کی باتوں پر مشتمل ہو، جس میں خلوصِ احساس و صداقتِ جذبات کا عنصر ہو۔ جو صراط مستقیم کی نشاندہی کرتی ہو اور جو حقیقی زندگی اور اس کی نیکی و فضیلت اور سنجیدہ مقصدیت کو ظاہر کرتی ہو۔ بُری شاعری وہ ہے جو خلوص و صداقت سے عاری ہو۔ جو پڑھنے والوں کو بدی اور گناہ کے راستے پر ڈال دے، لذت پرست بنا دے، گھٹیا مقاصد کا شیدائی کر دے، اور فضولیات و لغویات، بے اصل جھوٹی باتوں میں الجھا دے۔ اور جو کچھ یہاں اچھی اور بری شاعری کے بارے میں کہا گیا ہے وہ ادب کی سبھی اصناف کے لیے درست ہے۔ گویا اسلامی نقطہ نظر سے تخلیقی ادب کو محض فن کارانہ و حسن کارانہ معیاروں پر پرکھ کر اس کی قدر و قیمت اور عظمت و اہمیت کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ اُسے،

اخلاقی حقیقت پسندی کے معیار پر جانچنا بھی ضروری ہے۔ اخلاقی قدر کی حیثیت ثانوی نہیں ہے جیسا کہ ادب برائے ادب کے علمبردار سمجھتے ہیں بلکہ اولین ہے۔ اگرچہ حسن کی قدر بھی اپنی جگہ اہم ہے لیکن اس کی حیثیت اخلاقی قدر کے مقابلے میں ثانوی ہے۔ حسن اظہار ادب کا خاصہ ہے کہ اس کے بغیر ادب کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا لیکن ادب میں حسن کی سحرکاری کا استعمال اچھے انسان پیدا کرنے کے لئے ہونا چاہیئے کہ اچھے انسان ہی اچھا معاشرہ بناتے ہیں چونکہ ہر ادبی تخلیق میں زندگی اور معاشرہ مصنف کے نقطہ نظر سے پیش کئے جاتے ہیں اس لئے مصنف کے دل و دماغ، اس کی شخصیت و کردار، اس کے کردار و افکار، اس کے طرز احساس و طرز عمل کو ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے کہ یہی اس کی ادبی تخلیق کی نوعیت و کیفیت کو متعین کرتے ہیں عظیم المرتبت ادب اس وقت تک وجود میں نہیں آسکے گا جب تک مصنف واقعی بلند اخلاقی اقدار پر صدق دل سے ایمان کا حامل نہیں ہوگا۔ جلیل القدر ادبی تخلیقات ہمیشہ ایک بلند اخلاقی نصب العین کی طرف رہنمائی کرتی ہیں یا کسی اہم اخلاقی مسئلے کی گرہ کشائی کی طالب ہوتی ہیں کہ اخلاق کا انسانی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے۔

علامہ اقبال جو اسلامی تعلیمات کی روح سے خوب واقف تھے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

ہر وہ استعداد جو مبدء فیاض نے فطرت انسانی میں ودیعت کی ہے اور ہر وہ توانائی جو انسان کے دل و دماغ کو بخشی گئی ہے ایک مقصد و حید اور ایک غایت الغایات کے لئے وقف ہے یعنی قومی زندگی جو آفتاب بن کر چمکے، قوت سے لبریز جوش سے سرشار۔ ہر انسانی صنعت اس غایت آخرین کے تابع اور مطیع ہونی چاہیے اور ہر شے کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہیئے کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے یہ پیش پا افتادہ فقرہ جس سے ہمارے کانوں کی آئے دن تواضع کی جاتی ہے کہ کمال صنعت اپنی غایت آپ ہے، انفرادی و اجتماعی انحطاط کا ایک عیارانہ حلیہ ہے جو اس لئے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکا دے کر چھین لی جائے۔"

غرض خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ادب کے حسن، اس کی دلکشی اس کے سحر، اس کی تاثیر کو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے انسان کی سیرت سازی کے لئے اور انسانی معاشرے کی اصلاح و ترقی کے لئے استعمال کیا جانا چاہیئے محض حظ بخشی اس کا مطمع نظر نہیں ہونا چاہیئے۔

سید محمد یونس شاہ ایبٹ آباد

برصغیر کی تحریکوں میں اردو کا اسلامی کردار

اگرچہ مسلمانوں نے اردو زبان پر اجارہ داری کا دعویٰ کبھی نہیں کیا تاہم یہ رشتہ بڑا گہرا اور مضبوط ہے اگر یہ کہا جائے کہ مسلمان اور اردو لازم و ملزوم ہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ اس زبان میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو مسلمانوں کا طرہ امتیاز ہیں۔ یعنی اس زبان نے برصغیر پاک و ہند میں کئی بار ہجرت کی اور مہاجرت کا شرف حاصل کیا۔ جہاں گئی وہیں پیار و محبت سے اپنی جگہ بنالی برصغیر کی دیسی اور بدیسی زبانوں اور بولیوں کے ساتھ کبھی تو رواداری کا سلوک کیا اور کبھی ان کی بے پناہ یلغاروں کا ثابت قدمی سے مقابلہ کیا اور اس طرح اپنی سخت جانی کے سبب اپنے وجود کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ دوسری بولیوں کو پیچھے چھوڑ کر وہاں لسانی اجارہ داری قائم کرلی۔ چنانچہ انہی خصوصیات کی بنا پر آج ہم دیکھتے ہیں کہ سینکڑوں رکاوٹوں کے باوجود برصغیر میں اسی کا سکہ چل رہا ہے۔

ہندوستان میں مغلوں کا زوال ۱۸ ویں صدی عیسوی کے عشرہ اول یعنی عالمگیر رح کی وفات کے بعد اس تیزی سے شروع ہوا کہ ایک سو سال کے اندر اندر وہ سلطنت جس کی حدود قندھار سے آسام تک اور نیپال و تبت سے ساحل مالابار تک تھیں اس کے بیشتر حصوں پر فرنگیوں اور مرہٹوں کا قبضہ ہوگیا۔ یوں ۱۸ ویں صدی کے اختتام کے ساتھ ہی مسلمانوں کی عظمت کا آفتاب بھی غروب ہوگیا۔ اور اہل فرنگ کے اقتدار کی صبح صادق نمودار ہوئی اس صدی کا خاتمہ ایک اور حادثہ جانکاہ پر منتج ہوا یعنی سلطان ٹیپو کی شہادت۔ اس مرد مجاہد کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد انگریزوں نے جشن منایا اور کہا "اب تمام ہندوستان ہمارا ہے"۔ چنانچہ جب ۱۹ ویں صدی کا آغاز ہوا تو ہندوستان میں انگریزوں کی حریف کوئی طاقت باقی نہ رہی تھی۔

یہ تمام صورت حال انتہائی مایوس کن تھی۔ سیاسی ابتری اور انتشار کے علاوہ برصغیر میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت ناگفتہ بہ تھی، تہذیبی اور ثقافتی روایات آہستہ آہستہ دم توڑ رہی تھیں۔ دین و مذہب کی کیفیت بھی کچھ ایسی حوصلہ افزا نہ تھی مسلمان شیعہ، سنی، وہابی، مقلد اور غیر مقلد کی لامتناہی بحثوں میں الجھے ہوئے تھے۔ اور اسلام کی اصل ان کی نظروں سے اوجھل تھی ان حالات میں اس امر کی ضرورت تھی کہ کوئی بندۂ خدا اٹھے اور اس قوم کو مایوسی کے سمندر سے نکالنے کی سعی و تدبیر کرے تاکہ اس کے جسم مردہ میں پھر سے تب و تاب پیدا ہو۔ چنانچہ اس ضمن میں شاہ ولی اللہ دہلوی کی تحریک اصلاح نے نمایاں کردار ادا کیا۔ شاہ ولی اللہ (م ۱۷۶۲ء) نے جس تحریک کی بنیاد رکھی اس نے مسلمانوں کے قلوب و اذہان میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کردیں۔ اگرچہ اس کے فوری اثرات مرتب نہ ہو سکے اور اقتدار جو چھن چکا تھا بحال نہ ہو سکا تاہم ملک میں اس کے سبب ایک مثبت ردعمل کا اظہار یقیناً شروع ہوگیا ایک حلقہ اثر قائم ہوگیا جو اس تحریک کے عظیم مقاصد کو سمجھتا تھا۔ شاہ صاحب کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مغلوں کے اقتدار کی واپسی کے خواہاں نہ تھے بلکہ ایک ہمہ گیر انقلاب کے داعی تھے جو خالص اسلامی قدروں

کا حامل ہو اور جس کا مطمح نظر احیائے دین وملت ہو۔

شاہ ولی اللہ کی تحریک کو ان کے لائق فرزند شاہ عبدالعزیز نے بڑی عمدگی سے جاری رکھا۔ مذہب کے علاوہ سیاسی اور سماجی زندگی کے تمام شعبوں میں ہمہ گیر انقلابی تصورات کو تحریک کا نصب العین ٹھہرایا۔ اس عظیم منصب اور جدوجہد کی تکمیل میں جن مصائب کا سامنا ہوا وہ ہماری ملی تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ لیکن اس تحریک کے قافلہ سالاروں کی اولوالعزمی نے تمام آزمائشوں کو خندہ پیشانی سے قبول کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریک کی بازگشت ہندوستان سے نکل کر ایشیا کے دور دراز ملکوں تک پہونچنے لگی۔

شاہ عبدالعزیز نے ساٹھ سال تک طالبان حق کو رشد و ہدایت سے سرفراز کیا آپ نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے جمہور تک علم و ادب کا وسیع سرمایہ منتقل کیا۔ اسلامی علوم کے علاوہ آپ کی علمی استعداد بہت زیادہ تھی آپ نے ایک بار فرمایا "میں نے جو علم مطالعہ کئے ہیں ان کی تعداد ۱۵۰ ہے۔ ان میں نصف کے قریب ایسے تھے اور باقی دوسری اُمتوں کے۔" علم موسیقی میں بھی آپکو خاصا درک حاصل تھا۔ عربی و فارسی کے علاوہ اردو زبان و ادب پر ان کی کامل نظر تھی۔ شاہ نصیر کی غزل کی اصلاح کا واقعہ اس کا بین ثبوت ہے۔ یہ مشہور ہے کہ لوگ بامحاورہ زبان سیکھنے کے لئے ان کی وعظ میں شریک ہوا کرتے تھے ۷۔ ار جولائی ۱۸۲۳ء کو آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ مومن نے یہ تاریخ کی۔

دست بیداد اجل سے بے سروپا ہو گئے

فقر و دین، فضل و ہنر، لطف و کرم علم و عدل

آپ کے برادران گرامی۔ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے قرآن شریف کے ترجمے افادہ عام کے لئے کئے ایک نے تحت اللفظ اور دوسرے نے دہلی کی بامحاورہ زبان میں اس کار عظیم کو سرانجام دیا آپ کے بھائی شاہ عبدالغنی زیادہ مشہور تو نہ ہوئے لیکن ان کے عظیم فرزند شاہ اسماعیل شہید نے اس کمی کو پورا کر دیا۔

تحریک جہاد۔ سید احمد شہید بریلوی

ولی اللہی تحریک تقاضائے عصر کے تحت رفتہ رفتہ مسلح جدوجہد کی داعی بن گئی۔ سید احمد بریلوی اصلاح وانقلاب کی تربیت سے گزر کر اب جہاد بالسیف کا ڈول ڈال رہے تھے۔ آپ بہترین سپاہی ہونے کے علاوہ بے بدل واعظ و خطیب بھی تھے۔ آپ کی باتوں میں سحر کی سی کیفیت کا گمان ہوتا۔ آپ کے پراثر خطبوں سے متاثر ہو کر شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحیی آپ کے دست و بازو بن گئے۔

شاہ اسماعیل ایک شعلہ بیان مقرر، عظیم مصلح، جفاکش مجاہد اور فاضل ادیب بھی تھے۔ آپ کی شیریں مقالی نے تبلیغ

علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد دوم صفحہ ۴۳

مدت میں سرفروشان اسلام کا ایک گروہ اپنے گرد اکٹھا کر لیا۔ یہ لوگ حقیقی معنوں میں خدمت گار تھے خدا کی زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کر کے دنیا میں عدل و انصاف حق و صداقت اور امن کی حکومت کا قیام چاہتے تھے اس جہاد کا مقصد کوئی وقتی فائدہ یا عارضی اصلاح و ترغیب کا نہ تھا بلکہ یہ تحریک ایک ہمہ گیر اسلامی انقلاب کا تصور لے کر اٹھی تھی یہ صرف سکھوں سے جہاد نہ تھا بلکہ تمام طاغوتی قوتوں سے یہ لوگ خالص اعلائے کلمۃ الحق کے لئے برسرپیکار تھے۔ مجاہدین نے ابتداً متعدد کامیابیاں حاصل کیں لیکن بیگانوں سے زیادہ اپنوں کے ہاتھوں تحریک کو ناقابل تلافی نقصان پہونچا۔ بعض لشکریوں اور مقامی، افراد نے چند سکھوں کے عوض مجاہدین سے غداری کی۔ چنانچہ سید احمدؒ اور شاہ اسمٰعیل ۱۲۴۶ء کو بالاکوٹ (ہزارہ) کے مقام پر راہ حق میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے ؎ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را ولی اللٰہی تحریک یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کے اثرات دیرپا ثابت ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اس کے اثرات نمایاں ہیں یہ جنگ بھی بظاہر ناکامی سے دوچار ہوئی لیکن ملت اسلامیہ کے لئے مہمیز کا کام کر گئی اہل وطن کو احساس زیاں ہوا اور ملت کی بیداری کے آثار صاف نظر آنے لگے۔ نواب ناصر الملک مہتر آف چترال نے شہیدان بالاکوٹ کو یوں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

اے قلم بنویس حالات شہے	ثانیش پیدا نہ شد بعدش کسے
ہندیان خفتہ را بیدار کرد	بندگان نفس را احرار کرد
خون خود را در کہسار ریخت	لیک بیخ حریت در ہند بیخت
گفت اسمٰعیل معبودم خداست	پیشوائے من محمد مصطفیٰ است

شاہ اسمٰعیل ایک مصنف ہونے کے علاوہ اردو میں شاعری بھی کرتے تھے آپ نے ایک اعتبار سے اردو زبان کی بڑی خدمت کی۔ کیونکہ آپ کا تعلق چونکہ عوام الناس سے تھا اس لئے آپ نے ہمیشہ اپنے وعظوں اور خطبوں میں اردو کو اظہار کا وسیلہ بنایا آپ نے اردو میں تقویت الایمان اور منصب امامت تصنیف فرمائیں۔ اردو میں ایک مثنوی "سلک نور" بھی آپ سے یادگار ہے اس کے نعتیہ اشعار جذبہ و عقیدت کے علاوہ رسول خدا صلعم کی سیرت مبارکہ اور آپ کی ہمہ گیر تعلیم کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

ان واقعات و کیفیات کا مثبت ردعمل اردو زبان کے شعراً و ادبا پر نمایاں نظر آتا ہے اس دور کی بزم شعر و سخن میں ان اخلاقی و مذہبی موضوعات کی بہتر نمائندگی پائی جاتی ہے۔ نظم و نثر میں توحید و رسالت، اخلاق و معاشرت اور اسلامی اقدار کو اجاگر کرنے کے لئے بہترین کتابیں منظر عام پر آئیں۔ اکثر شعرأ نے حمدیہ اور نعتیہ مقاصد لکھے۔ مثنویوں اور غزلوں کو بھی اظہار کا ذریعہ بنایا گیا اگرچہ اس عہد کی مروجہ شاعری زوال پذیر تدروں کی ترجمان تھی جس میں بے مقصد ذہنی کاوش کے سوا کچھ نہ تھا اور شعرائے کوہ و کندن و کاہ برآوردن کی مثال صادق آتی تھی تاہم یہ ولی اللٰہی اثرات کا کمال تھا کہ اردو زبان کی جملہ اصناف کا رخ

صحیح سمت کو موڑ دیا اس خانوادہ کے فیضان نظر سے جو لوگ فیضیاب ہوئے ان میں مفتی صدرالدین آزردہ، شاہ غلام علی نقشبندی، مولوی عبدالحی، مفتی الہی بخش کاندھلوی، مولانا میر محبوب علی مولانا فضل حق خیرآبادی اور سید احمد شہید جیسے مشاہیر زمانہ تھے جن کی علمی و ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ تحریک جہاد نے بھی بہت سوں کے دلوں کا کایا پلٹ دی۔ اس کے متفقین اور متوسلین نے دامے درمے اور سخنے تجدید دین اور احیائے ملت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا ان لوگوں میں حکیم مومن خان دہلوی۔ مولانا عبدالکافی مرادآبادی، حکیم غلام مولیٰ قلق میرٹھی، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا محمد کافی شہید اور حضرت مولانا امداد اللہ مہاجر مکی جیسے مشاہیر عصر تھے۔ مومن خان سید احمدؒ کے ہاتھ پر بیعت تھے۔ تحریک جہاد میں وہ جہاد بالسیف تو نہ کر سکے لیکن جہاد بالقلم کا موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا اس وقت دین اسلام اور وطن عزیز پر جو غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا وہ ایک انقلاب کل کا متقاضی تھا اور سوچ بچار کرنے والے دماغ اسی نہج پر سوچ رہے تھے مومن نے ذیل کے شعر میں روح عصر کی کیسی سچی ترجمانی کی ہے۔ ؎ اے حشر جلد کر تہ و بالا جہان کو یوں کچھ نہ ہو امید تو ہے انقلاب میں

مومن کے سرمایہ شعر میں ایک جہادیہ مثنوی بھی یادگار ہے جو نہ صرف مذہبی جوش و عقیدت کی وجہ سے بلکہ ادبی حیثیت سے بھی نادر ہے ابتدا یوں ہوتی ہے۔ ؎

پلا مجھ کو ساقی شراب طہور
کہ افغاں شکن ہے خمار فجور

کوئی جرعہ دے دین خدا جام کا
کہ آجائے بس نشہ اسلام کا

بہت کوشش و جاں نثاری کروں
کہ شرع پیمبرؐ کو جاری کروں

امیر جہاد سید احمد کی مدح میں ؎

زہے سید احمد قبول خدا
بسر امتان رسول خدا

رہے حشر تک زندہ و نیک ذات
ہے کفار کی موت اسکی حیات

ہوا مجتمع لشکر اسلام کا
اگر ہو سکے وقت ہے کام کا

جو داخل سپاہ خدا میں ہوا
فدا جی سے راہ خدا میں ہوا

حبیب حبیب خداوند ہے
خداوند اس سے رضامند ہے

دعائیہ ابیات :- الہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

تو اپنی عنایت سے توفیق دے
عروج شہیدا در صدیق دے

کرم کر نکال اب یہاں سے مجھے
ملا دے امام زماں سے مجھے

یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں
مری جاں فدا ہو تری راہ میں

میں گنج شہیداں میں مسرور ہوں
اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

تحریک علی گڑھ ⊕ :- سرسید احمد خان نے علی گڑھ میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک معمولی مدرسہ
سے کام کا آغاز کیا لیکن جلد ہی یہ مکتب دار العلوم میں تبدیل ہوگیا اور پھر سید مرحوم کا بے پناہ خلوص رنگ لایا اور یہی تعلیمی درسگاہ
ایک تحریک کا مرکز و محور بنگئی جس کا مقصد ادنی برصغیر میں ملت اسلامیہ کی دینی، تہذیبی اور سیاسی روایات کا تحفظ و بقا تھا۔
اس میں شک نہیں کہ سرسید علوم وجدیدہ کو قوم کے لئے اولین ضروری سمجھتے تھے۔ اور اس طرح وہ غیر ملکی زبانوں کی تدریس
کے بھی حامی تھے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ مشرقی علوم اور اردو زبان کو ثانوی حیثیت دینا چاہتے تھے اس مغالطے
کی وجہ سے ان کی کاوشوں کو ایک عرصہ تک شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا جاتا رہا۔ سرسید کے اپنے الفاظ میں ان کا نصب العین
یہ تھا۔ "ہمیں سب سے مقدم یہ کرنا ہے کہ ہم مسلمان رہیں اور مذہب اسلامی کی حقیقت ہمارے دل میں قائم رہے چنانچہ
ضروری ہے کہ ہم انگریزی تعلیم بھی دیں اور عقائد مذہبی سے بھی روشناس کرائیں اور جہاں تک ممکن ہو اپنے نوجوان طلبہ
کو فرائض مذہبی کا پابند رکھیں۔ تاریخ اسلام اور مذہب اسلام کے شیوع سے ان کو آگاہ کریں اس کے بعد ان کو اخوت اسلامی
کا سبق دیں۔ تبلادیں کہ اخوت اسلامی کیا چیز ہے جو نسبی اخوت سے بھی زیادہ مستحکم ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ سرسید اور ان کے رفقائے کار نے اس نصب العین کو لفظاً و معناً پورا کر دکھایا۔ حالی نے مسدس لکھ کر قوم
کے جسم مردہ میں ایک نئی روح پھونک دی۔ نیز ادب و شعر کے افادی اور اصلاحی پہلوؤں کی طرف متوجہ کیا۔ شبلی نے تاریخ کے
تقاضوں کو ایک مقدس فرض جان کر پورا کیا۔ نذیر احمد اگرچہ قافلہ علی گڑھ کے راہ رو نہ تھے تاہم منزل ایک ہی تھی ہدف ایک
ہی تھا۔ چنانچہ انہوں نے علوم اسلامیہ، تفسیر و ترجمہ اور اصلاحی کہانیوں سے قوم کی رہنمائی کی۔
محسن الملک اور وقار الملک نے عقل و فراست، حکمت و دانش سے مملو مضامین لکھے۔ مولوی چراغ علی کی علمیت اور تفکر سے
کون انکار کر سکتا ہے؟ حق یہ ہے کہ علیگڑھ کی تحریک برصغیر میں مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کا درجہ رکھتی ہے۔
اکابرین ملت نے قوم کی آئندہ راہیں متعین کر دیں اس تحریک کا ایک اثباتی پہلو یہ بھی ہے کہ اس تمام تگ و دو میں اردو کو
رابطے کی زبان کی حیثیت سے جمہور میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مسلمانوں کی کشمکش حیات میں اردو زبان کی معیت اور ہمرہی
قابل تحسین ہے۔ یہ چولی دامن کا ساتھ ہی تھا کہ جس نے اردو پر مسلمانوں کا لیبل چسپاں کر دیا اور یہ اردو زبان ہی تھی کہ جس
کے سبب سرسید نے دو قومی نظریے کی ابتدا برصغیر میں ڈالی۔ اگر ہندو متعصب نہ ہوتے اور اردو ہندی کا جھگڑا کھڑا نہ کرتے
تو شاید سرسید بھی اکھنڈ ہندوستان کے قائل رہتے۔ سرسید پر ہندوؤں کا لسانی تعصب ظاہر ہوا تو انہیں یقین ہوگیا کہ برصغیر
میں ہندو اور مسلمان اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ اسی سوچ نے اسی وقت پاکستان کی بنیاد رکھ دی تھی۔ گویا بہ الفاظ دیگر
پاکستان کی تخلیق میں اردو زبان نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ عہد سرسید تو اردو زبان و ادب کی تاریخ میں بجا طور پر سنہری دور کہلانے کا

⊕ تذکرہ سرسید۔ امین زبیری ص ۵۷

متحق ہے۔ اس دوران اردو کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا ان گنت اخبارات رسائل اور کتب متفرقہ وجود میں آئیں اسی دور میں اردو اور مسلمان دونوں کا بول بالا ہوا۔

علیگڑھ کے زیر اثر ملک کے دوسرے حصوں میں بھی مختلف مذہبی اور تعلیمی تنظیموں کا قیام عمل میں آیا۔ جن کا مقصد مسلمانوں کے عقائد و نظریات کو پختہ و استوار کر کے ذہنی غلامی سے چھڑانا اور مکمل آزادی کی راہ ہموار کرنا تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۴ء میں قاضی حمید الدین نے انجمن حمایت اسلام لاہور کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن نے قومی سیاست اور مذہبی احیاء میں نہایت شاندار کردار ادا کیا۔ اس کے سالانہ جلسوں میں بڑے بڑے عمائدین قوم، سیاسیین اور علمائے دین شرکت کرتے اور تقریر و تحریر کے ذریعے ملک و ملت کے نوجوانوں کی رہنمائی کرتے۔ علامہ اقبال نے اپنی نئی نظمیں اسی انجمن کے سٹیج سے پڑھیں۔

حسن علی آفندی نے ۱۸۸۵ء میں سندھ میں مدرسۃ الاسلام علیگڑھ کی طرز پر قائم کیا۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے ابتدائی تعلیم اسی مدرسہ سے حاصل کی تھی اسی سال انجمن مفید اہل اسلام اور انجمن اسلامیہ مدراس کا قیام جنوبی ہند میں عمل میں آیا۔

دارالعلوم دیوبند :۔ ان اسلامی مدرسوں میں سب سے زیادہ منظم اور حساس تعلیمی درسگاہ ضلع سہارنپور کی ایک بستی میں دارالعلوم دیوبند کے نام سے مولانا رشید احمد گنگوہی اور بعض دوسرے محب وطن اور قوم علمائے دین کی کوششوں سے قائم ہوئی۔ مذہب کی بنیادی صداقتوں کو ذہن نشین کرانے کے علاوہ یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ اپنی روشن خیالی، وسعت قلبی اور رواداری میں عام طور پر ممتاز ہوتے۔ نصاب تعلیم میں یہ مدرسہ مسلک ولی اللٰہی کا ترجمان یعنی مدرسہ رحیمیہ دہلی کی پیروی کرتا تھا یہاں عمومی تعلیم کے علاوہ عملی اسلامی زندگی کی تربیت کا خاص خیال کیا جاتا یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شکست و ریخت کو جس طرح اس کے کارپردازوں نے سنبھالا دیا اور تعمیر نو میں جو رول ادا کیا وہ ناقابل فراموش ہے۔ جدوجہد آزادی میں دیوبند بذات خود تحریک آزادی کی علامت سمجھا جانے لگا۔ انگریزی استعمار کے خلاف یہاں شدید غم وغصہ پایا جاتا تھا چنانچہ "ریشمی رومال" اور "اتحاد بین المسلمین" جیسی تحریکیں یہیں سے اٹھیں۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی سربراہی میں ایسے کئی منصوبے عملی جدوجہد کے لئے تیار کئے گئے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کی کوششیں بھی اسی ضمن میں آتی ہیں۔ الغرض ملت اسلامیہ کے عروج و عظمت کے لئے جتنی تحریکیں ہندوستان اور بیرون ہند وقتاً فوقتاً اٹھتی رہیں ان سب میں علمائے دیوبند کا خصوصی کردار رہا ہے دیوبندی مسلک منظم کرنے اور آگے بڑھانے والے اکابرین ملت میں مولانا گنگوہی، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا محمود الحسن، مولانا انور شاہ اور حسین احمد مدنی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ یہ سب کے سب عاشقان رسول صلعم تھے اور ان کا مبدأ و منشا امت مسلمہ کی زندگیوں میں طہارت و تقوی، فقر و استغنا اور تواضع و انکساری کی روح پھونکنا تھا۔ دیوبند کے اس کردار کو مولانا ظفر علی خان نے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

شاد باش و شاد زی اے سرزمین دیوبند ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

ناز کر اپنے مقدر پر کہ تیری خاک کو کر لیا ان عالمان دین قیم نے پسند

جان کردیں گے جو ناموس پیمبر پر فدا ۔ حق کے رستے پہ لٹا دیں گے جو اپنا بند بند

حق یہ ہے کہ دیوبند کی تعلیم و تربیت نے مسلمانوں میں نڈر، بیباک، روشن خیال اور شعائر اسلام کے پابند پیرو کار پیدا کئے۔ جنہوں نے ہندوستان کی سیاسی اور مذہبی حالت کو کئی فکری زاویوں سے پروان چڑھایا۔ مولانا قاسم جنگ آزادی میں بنفس نفیس شاملی کے محاذ پر شریک ہو کر زخمی ہوئے اور ان کے ساتھی حافظ محمد ضامن شہید ہوئے۔ مولانا موصوف نہ صرف عالم دین تھے بلکہ ایک مرشد کامل اور پیر طریقت تھے آپ اچھے ادیب و شاعر بھی تھے۔ نظم و نثر کی کئی تصانیف آپ سے یادگار ہیں آب حیات، قبلہ نما اور اجوبہ اربعین توحید و رسالت کے اسرار و رموز پر مشتمل ہیں۔ شاعری میں "قصائد قاسمی" آپ کے کمال فن پر دال ہے قصائد قاسمی کا پہلا قصیدہ نعتیہ ہے جس کے ۱۵۱ اشعار ہیں۔

تو فخر کون و مکاں زبدۂ زمین و زماں ۔ امیر لشکر پیغمبراں شہ ابرار

کہاں بلندی طور اور کہاں تیری معراج ۔ کہیں ہوئے ہیں زمین و آسماں ہموار

د لے یہ رتبہ کہاں مشت خاک قاسم کا ۔ کہ جائے کوچہ اطہر میں تیرے بنکے غبار

مولانا محمد یعقوب نانوتوی دار العلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہوتے کے علاوہ، اردو و فارسی کے شاعر بھی تھے۔ حاجی مولانا امداد اللہ سے بیعت تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی آپ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ آپ نے زندگی میں تین تمناؤں کا اظہار کیا تھا اور ان کی قبولیت کے لئے اللہ سے دعاگو رہتے تھے پہلی دعا یہ فرمائی کہ عرب میں حکومت شرعیہ اسلامیہ اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ دوسری یہ کہ "شرح ابی داؤد شریف" زندگی میں تکمیل کو پہونچ جائے۔ اور تیسری یہ کہ جنت البقیع جوار رسول صلعم میں دفن ہونا نصیب ہو ایک بار کہا الحمد للہ دعاؤں کی قبولیت جیتے جی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ تیسری دعا موت میں ڈھونڈ تا ہوں دیار حبیب ہی کا انتظار ہے۔ انگریزوں نے جب مجاہدین اسلام کو تلاش کر کے مقدمات قائم کرنے شروع کئے تو آپ بھی حاجی امداد اللہ کے بعد ہجرت فرما کر مکہ شریف روانہ ہو گئے مولا مستجاب الدعوات تھے۔ آپ کی یہ آخری دعا بھی شرف قبولیت سے ہمکنار ہوئی ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ بعد نماز ظہر مدینہ منورہ میں واصل بحق ہوئے اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ نعت رسول صلعم میں آپ کا قصیدۂ میمیہ بڑا مقبول ہوا۔

کہاں کہاں پھرائے گی گردش ایام ۔ کبھی تو پائے کہیں خاطر حزیں آرام

رسول ایسا کہ مرسل ہیں امتی اس کے ۔ وہ بادشاہ کہ سب بادشاہ اس کے غلام

یبایعونک انما یبایعون اللہ ۔ تمہارے ہاتھ پہ بیعت کا یہ ہوا اکرام

جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے سیاسی و ملکی استحکام حاصل کرتے ہی عیسائیت کی تبلیغ کے منظم منصوبوں پر کام شروع کر دیا۔ اگرچہ برصغیر کے تمام مذاہب ان کی زد میں تھے لیکن انہوں نے بطور خاص اسلام، اور بانی اسلام کو اپنی بے جا تنقید کا ہدف ٹھہرایا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے عقائد پر یلغار کی جائے اور ان کو روح اسلام

سے برگشتہ کر کے ان کے دینی جذبہ و احساس کو مٹا دیا جائے گویا افرنگ "روح محمدؐ ان کے بدن سے نکال دو" کی پالیسی پر برملا عمل پیرا تھے برطانوی پارلیمنٹ مسٹر مینگلس نے اپنی تقریر میں کہا کہ "اب ہماری کوشش یہ ہے کہ عیسیٰؑ مسیح کی فتح کا جھنڈا ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے" اس کی تصدیق فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی کے خطبات سے بھی ہوتی ہے جہاں وہ عیسائی مبلغین کی کامیابیوں کا بار بار تذکرہ کرتا ہے۔ انگریزوں نے عیسائیت کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو بھی باہم یکدگر دست و گریبان کر دیا۔ ہندومت کے عالموں کو در پردہ شہ دلائی۔ چنانچہ عیسائی اور ہندو، دونوں نے مل کر اسلام کو ہدف بنایا۔ اب مسلمان علمائے کرام اور دانشور بھی خم ٹھونک کر میدان عمل میں اترے۔ چنانچہ اس جوابی کارروائی نے جہاں برصغیر میں مسیحی فتح کا خواب بکھیر کر رکھ دیا وہاں اردو زبان کے دامن کو رنگا رنگ پھولوں سے بھر دیا اسلام کی مدافعت میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ نظم اور نثر دونوں کا اظہار و ابلاغ کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اس طرح ادیان عالم کے مختلف موضوعات پر ایک کثیر سرمایہ علم فراہم ہو گیا۔ اسی دور میں مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ شروع ہوا جس میں تقریروں، وعظوں اور خطبوں کے ذریعے دلائل و براہین کی روشنی میں اسلام کی حقانیت کو ثابت کیا گیا۔

اس دور میں حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان نے مسلمانوں کا کماحقہ ساتھ دیا۔ اس زمانہ میں اردو ترویج اور اشاعت کا بڑا سامان ہوا۔ ایک ورق کے اشتہار سے لے کر ضخیم کتابوں تک اردو میں لکھا گیا۔ پڑھا گیا اور بولا گیا۔ خواجہ حالی نے "تریاق مسموم" لکھ کر عیسائیوں کو مسکت جواب دیا۔ محسن الملک نے "آیات بیّنات" لکھی۔ سرسید نے "خطبات احمدیہ" لکھی۔ شبلی نے بہت سے تاریخی حقائق کے منطقی نتائج دکھا کر اسلام پر اعتراضات کے شافی جوابات دیے۔ پادری عماد الدین کی کتاب "تاریخ محمدی" کا جواب مولوی چراغ علی نے "تعلیمات" کی صورت میں دیا نیز متعدد رسائل معترضین اسلام کے رد میں لکھے۔ غلام احمدؒ قادیانی کی "براہین احمدیہ" کے بعض مقامات انہی کی علمی بصیرت کے رہین منت ہیں

مولانا ابو المنصور مناظر اسلام کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے۔ ان کی "نوید جاوید" اس طرز اور فن پر بہترین تصنیف ہے ان کا بیان ہے کہ "فدوی نے عرصہ پندرہ سال میں صدہا پادریوں سے مختلف شہروں میں مناظرہ کیا" عیسائیوں کی "شکوک کفارہ" کے جواب میں "ابحاث ضروری" لکھی۔ نیز عماد الدین کی کتاب "تحلیق الایمان" کا جواب "صیانت الاسلام" کی شکل میں دیا۔ مولوی رحمت اللہ کیرانوی نے پادری فنڈر اور اس کے طائفے کو جس میں لاہور کا بشپ والپن فرنچ بھی شامل تھا۔ مناظرہ کا چیلنج دیا۔ یہ مناظرہ آگرہ کے شہر میں ہوا۔ اس کے منصفین میں ہندو اور انگریزی بھی شامل تھے۔ تیسرے ہی روز مخالفین میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ مولوی صاحب نے عقلی اور نقلی دلائل سے یہ ثابت کر دیا کہ موجودہ انجیل تحریف شدہ ہے۔ اگرچہ مولوی رحمت اللہ بیسیوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کو زمانہ طالب علمی ہی سے مناظرے کا شوق تھا۔ چنانچہ آپ نے متعدد مناظروں میں حصہ لیا ان مناظروں کے موضوعات کافی پیچیدہ اور فلسفیانہ ہوتے تھے۔ مثلاً خدا، تخلیق کائنات، قرآن و انجیل اور وید وں کا الہامی وغیرہ ہونا۔ لیکن عوام الناس کو جن مسائل میں الجھایا جاتا یا ورغلایا جاتا وہ عیسائی مبلغین کا تثلیث کو توحید کے روپ میں پیش کرنا تھا۔ یہ لوگ عوام کو

کفارہ کے چکر میں ڈال کر ان کے ذہنوں سے گناہوں کا بوجھ اتار دیتے۔ انہیں نجات کا مژدہ جانفزا سناتے اور اس طرح عیسائیت کے حلقہ میں داخل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ان اعتراضات کو مکمل اور مدلل طریقے سے جس نے رد کیا وہ نامور عالم دین مولوی ثناءاللہ امرتسری تھے ان کی تمام عمر مناظروں اور مجادلوں میں بسر ہوئی ان کی تصانیف کی تعداد بلاشبہ سینکڑوں سے متجاوز ہے جو عیسائیوں خصوصاً آریہ سماج کے مقابلہ میں لکھی گئیں انہوں نے پادری ٹھاکر دت کی کتاب "عدم ضرورت قرآن" کے جواب میں "تقابل ثلاثہ" (توریت۔ انجیل۔ قرآن) لکھی۔ پادری برکت اللہ کی تین کتابوں کا جواب "اسلام اور مسیحیت" کی شکل میں رقم کیا آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرستی کی تصنیف "ستیارتھ پرکاش" جس میں قرآن کریم پر ۱۵۹ اعتراضات وارد کئے گئے تھے کا جواب "حق پرکاش" لکھ دیا۔ راجپال کی ہرزہ سرا تصنیف "رنگیلا رسول" کا پہلا جواب غازی علم دین شہید نے اپنے تیشہ کی دہار سے دیا۔ مولوی ثناءاللہ فرمایا کرتے تھے کہ ان دو کتابوں کو اللہ تعالیٰ میری نجات اخروی کا ذریعہ بنائے گا۔

الغرض برصغیر میں جو بھی تحریک اٹھی اس کو پروان چڑھانے میں اسلامیان ہند کے ساتھ ساتھ اردو زبان نے بھی نمایاں کردار سرانجام دیا ہے۔ آج ہمارا علمی و ادبی، تہذیبی و ثقافتی اور سیاسی و سماجی ورثہ اسی زبان کا رہین منت ہے۔ اور برصغیر کے مسلمانوں کی شناخت ہے عربی و فارسی زبانوں کے جملہ علوم و فنون کا ذخیرہ تراجم کی شکل میں اس کے ہاں موجود ہے۔ اصل یہ ہے کہ اردو نے ہی ہمیں اسلام سے روشناس کروایا ہے اردو ہی کی وساطت سے دین متین کو صوفیائے کرام نے بھی برصغیر کے عوام تک پہونچایا۔ چنانچہ آج پاکستان میں یہ کسی کی مادری زبان نہیں ہے۔ لیکن قومی زبان کا فخر اسی کو حاصل ہے یہ رواداری میں مسلمانوں کے مزاج کی صحیح عکاس ہے۔ نہ لینے میں جھجک محسوس کرتی ہے نہ دینے میں بخل سے کام لیتی ہے۔ برصغیر میں اسلام کے حوالے سے اردو زبان کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

انور سدید

قرونِ وسطیٰ کی اسلامی تحریک

جس وقت ازمنۂ وسطیٰ کے اندھیرے عیسائیت کی روشنی کو چاٹ رہے تھے تو مشرق میں روشنی کا ایک اور سیلاب آیا ہوا تھا۔ ہیگل نے اسے مشرق کا انقلاب کہا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ اس انقلاب نے پہلے حقیقت واحد کو انسان کے مطلق انہماک اور توجہ کا مرکز بنایا اور بالآخر اسے آزادی کا مکمل احساس بھی تفویض کر دیا۔ برٹرنڈ رسل نے لکھا ہے کہ "دورِ وسطیٰ کو تاریک عہد صرف اس لئے کہا جاتا ہے کہ ہم نے یورپ پر ناواجب طور پر توجہ مرکوز رکھی حالانکہ اس زمانے میں ہندوستان سے اسپین تک اسلام کی درخشاں تہذیب نے فروغ پایا تھا۔ چنانچہ اس وقت عیسائیت نے جو کچھ کھویا تھا وہ درحقیقت تہذیب کا زیاں نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس تھا۔

برٹرنڈ رسل نے اس صداقت کو باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ تہذیبی ترقی کے منہاج صرف یورپ ہی نہیں تھی بلکہ مشرق میں بھی کئی ایسی تحریکیں رونما ہو رہی تھیں جن کے اثرات ہمہ گیر تھے اور جب یورپ خواب گراں سے جاگا تو اس نے مشرق کے انہی سرچشموں سے بیش بہا [illegible] استفادہ کیا روم اور یونان کی تہذیب کے طویل جمود نے عیسائیت کے فروغ کے لئے زمین ہموار کی تھی اس مذہب کو نسبتاً بڑے پیمانے پر مقبولیت حاصل ہوئی تو اس نے زیادہ تر مغرب کو اپنے دائرہ قبول میں لیا۔ دوسری طرف جب اسلام کا ظہور [illegible] ا تو اس نے اپنے نظریات کو سب سے پہلے مشرق اور مشرق وسطیٰ میں مقبول بنانے کی کوشش کی شام آنحضرتؐ کی وفات کے دو سال بعد اور ایران پانچ سال بعد اسلامی تصورات کو قبول کر چکا تھا۔ ہندوستان میں ٦٦٤ عیسوی میں اور قسطنطنیہ میں ٦٦٩ عیسوی میں اسلام کے آثار کا ظہور ہو چکا تھا پھر فتوحات کا رخ مغرب کی طرف بڑھ گیا۔ اور آٹھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں سپین بھی مسلمانوں کے زیرِ نگیں آ گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عیسائیت کی تعلیم یورپ کے محدود سے خطے میں پھیلی لیکن اسلام نے نہ صرف مشرق اور مغرب کو متاثر کیا بلکہ مہاتما بدھ اور زرتشت کی صدیوں پرانی روایات کو بھی شکستہ کر دیا۔

اسلامی تحریک کو زیادہ فروغ اس وقت حاصل ہوا جب روم اور ایران پر سیاسی اور تہذیبی زوال غلبہ پا چکا تھا۔ برٹرنڈ رسل لکھتا ہے کہ اس وقت ایران طویل جنگوں میں اپنی قوت کھو چکا تھا۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ ایرانیوں اور رومیوں کا یہ حاصل بن گیا تھا کہ عیش کے دن گذاریں۔ ایران کے مذہبی آتش کدے آباد تھے لیکن دلوں کی آگ بجھ چکی تھی۔ ہندوستان میں بدھ مت اور یورپ میں عیسائیت نے ایک مضبوط خانقاہی نظام مرتب کر لیا تھا۔ اول الذکر نے دنیاوی زندگی کو لعنت قرار دے کر ترکِ دنیا کا سبق دیا اور مؤخر الذکر نے انسان کو پیدائشی گنہگار ٹھہرا کر اس کے معصوم دل پر احساسِ گناہ کی دبیز تہہ جما دی تھی۔ نتیجہ [illegible] کہ اس جامد رہبانیت نے انسان سے فکری تنوع چھین لیا اور ایک مخصوص مضمحل یکسانیت میں انسان تخلیقی سرگرمی سے عاری ہو گیا۔

اسلام نے نفیِ ذات کے تصور کو اثباتِ ذات سے اور فنا کو بقائے دوام کے نظریے سے سر کیا، اس میں پیدائشی برتری

کا تصور موجود نہیں ۔ ہر فرد اپنے ذاتی اعمال اور اپنے نفس کی اعلیٰ تربیت کی بنیاد پر ہی بزرگ و برتر مانا جاتا ہے اسلام نے محض رنگ و نسل کے بتوں کو ہی نہیں توڑا بلکہ ثنویت اور تثلیث کے برعکس وحدت کا تصور پیش کیا اور خدا تے مطلق کو زندگی کی سب سے بڑی محرک قوت قرار دیا ۔ چنانچہ یہودیوں نے جس خدا کو ذاتی ملکیت بنا لیا تھا وہ خدا اب اسلام کی رو سے رب العلمین تھا اور اس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کسی وسیلے کی ضرورت نہیں تھی ۔ ہادی اسلام نے خود اپنے لئے بھی کسی برتر مقام کا تقاضا نہیں کیا وہ پیغمبر بھی تھے اور انسان بھی ، مساوات انسانی کا یہ ہمہ گیر تصور اتنا پُرکشش تھا کہ مسلمان بہت جلد روئے عالم پر چھا گئے اور بقول ہیگل جن لوگوں نے اسلام قبول کیا انہیں دوسرے مسلمانوں کے برابر حقوق مل گئے ۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اسلام کی قوت عیسائیت کے کھنڈروں پر اس وقت استوار ہوئی جب عیسائیت کے لئے تہذیب کا لفظ کھنڈروں ہو چکا تھا ۔ اسلامی تحریک بقول جسٹس محمد منیر "خود اپنے اندر ایک ارتقائی قوت رکھتی ہے اس تحریک نے چونکہ انسان کو مادی اور روحانی دونوں سطحوں پر تسکین دی تھی اس لئے اسلام کا پیغام زیادہ موثر ثابت ہوا اور اس تحریک کے اثرات زندگی کے تمام شعبوں میں نفوذ کر گئے ۔

اسلامی تحریک کے مختلف ادوار میں علوم و فنون نے بھی بڑی ترقی کی ۔ خلیفہ المنصور اور ہارون الرشید کے زمانے میں تخلیقی فنون خاص و عام کو ذہنی طمانیت عطا کرتے تھے ۔ اور عباسی دارالحکومت تہذیب و تمدن کا گہوارہ بن چکا تھا سلاطین عباسیہ نے دارالحکمت کے نام سے تالیف و ترجمہ کا ایک الگ ادارہ قائم کیا جو کم و بیش دو صدیوں تک کام کرتا رہا ۔ ابن اسحاق نے افلاطون کی کتابوں کا ترجمہ براہ راست یونانی کتابوں سے کیا تھا ۔ فلاطینوس کے مضامین کا ترجمہ دینیات ارسطو کے نام سے ہوا الکندی نے ارسطو اور افلاطون کے دبستانوں میں موافقت پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ الخوارزمی نے ہندی اعداد کے استعمال سے نیا طریقہ شمار دریافت کیا ان تراجم نے اسلامی فکر کو علوم کی بعض نئی دینوی رو وں سے آشنا کیا ، چنانچہ اہل علم کا ایک طبقہ اعتقادات کا از سر نو جائزہ لینے پر بھی مائل ہو گیا ۔

معتزلہ ہر چیز کو عقلی حیثیت میں پرکھنے اور مسائل کو آزادہ فکری سے حاصل کرتے تھے ۔ اور بعض اوقات تو وہ اپنے دلائل کے سامنے احکامات خداوندی کو بھی خاطر میں نہ لاتے اور قرآن اور حدیث کی تشریحات میں تاویلات کا استعمال فراوانی سے کرنے لگتے ۔ معتزلہ کی تحریک عقلی تھی لیکن مذکورہ وجوہ کی بنا پر اسے بہت جلد ردعمل کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے باطن سے ، ابوالحسن الاشعری کی تحریک اشاعرہ ابھری ، اشعری نسبتاً معتدل مزاج کا عالم تھا انہوں نے متقدمین کمترین کی راہ اختیار کی اور فلسفے پر کتاب و سنت کی روشنی میں بحث کی ۔ انہوں نے علم کلام کو اس طرح واضح کیا کہ معتزلہ کا خاتمہ بحث و تنقید کے مضبوط دلائل سے ہی ہو گیا تاہم اشعری کی اپنی نظر چونکہ مراجعت پسند تھی اس لئے اس نے پر زور دلائل سے نظریہ قدر و اختیار کی تردید کی اور قانون علت و معلول سے انکار کر دیا ۔

تحریک اشاعرہ کو اپنے نقوش مرتسم کرنے کے لئے قریباً ڈیڑھ صدی کا عرصہ لگا ۔ حضرت امام غزالی اس عہد کی وہ

تابناک شخصیت ہیں جنہوں نے اسلامی تحریک کو ایک مرتبہ پھر وجدان و الہام کی راہ دکھا دی۔ امام غزالی نے شکوک و شبہات کی دنیا پر ٹھیک روشنی سے فتح پائی تھی۔ چنانچہ انہوں نے عام لوگوں کو بھی افکار کے اس داخلی خزینے کی طرف متوجہ کیا جو ان کے داخل میں موجود تھا۔ امام غزالی کی تصنیفات میں احیاء العلوم الدین اور تہافتہ الفلاسفہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے ان کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے مذہبی اعتقادات کو متوازن کرنے کی کوشش کی اور ابو موسیٰ اشعری نے ملائیت کو جو فروغ دیا تھا اسے قریباً ختم کر دیا انہوں نے وجدانی کشف کو اہمیت دے کر عقل اور وجدان کے درمیان ایک واضح حد فاصل قائم کر دی نتیجہ یہ ہے کہ عقل کی سنگلاخ پیروی کرنے والے لوگوں میں حضرت امام غزالی کی وجدانیت کچھ زیادہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکی۔

اسلام کی ابتدا سے اس کے سیاسی زوال تک ایک رو جو ہمیشہ جاری و ساری رہی اور جس نے عمل اور رد عمل کی تحریکوں کو یکساں طور پر متاثر کیا وہ تصوف کی رو تھی۔ نویں صدی عیسوی سے قبل تصوف محض ایک ذہنی رویہ تھا جو ظاہری شان و شوکت مادی آسودگی اور ظاہری جاہ و جلال کے خلاف پیدا ہوا اس دور میں اس کے نقوش قدرے بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ نویں صدی کے بعد تصوف نے ما بعد الطبیعات مرتب کر لی اور ایک مخصوص نظام کو فروغ دیا۔ چنانچہ تصوف ایک فعال تحریک کی صورت میں اسلام کی عظیم تر تحریک پر بھی اثر انداز ہونے لگی۔ بادی النظر میں معتزلہ نے فلسفے کی بحث میں عقل کو مذہب کا ثالث قرار دے کر جس دائرے کی ابتدا کی تھی وہ دائرہ امام غزالی پر آ کر ختم ہو گیا تھا چنانچہ تصوف کی تحریک جس نے زندگی کے بہت سے شعبوں کو متاثر کیا تھا دو دبستانوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک دبستان تصوف کو شریعت کے تابع رکھنے پر مصر تھا اور دوسرا طریقت کو شریعت سے افضل قرار دے کر قلندری طریق رائج کرنے کا دعویٰ دار تھا۔ اول الذکر دبستان مذہبی عقائد اور رسوم میں راسخ الاعتقاد اور مؤخر الذکر آزادئ فکر اور آزادئ عمل تھا۔ قرون وسطیٰ کے ادبا، شعرا اور فلسفی مثلاً عمر خیام، المعری، فارابی اور ابن سینا وغیرہ جو عجمی روایت سے زیادہ متاثر تھے دوسرے دبستان سے تعلق رکھتے ہیں۔

تصوف کی تحریک فکر کے مقابلے میں باطنی وجدان اور روحانی احساس کی تحریک تھی۔ صوفیا نے اس کے فروغ کو آزاد نشو نما سے تعبیر کیا ہے تاہم اس کے بعض ماخذات قرآن و حدیث میں بھی تلاش کئے گئے ہیں۔ آنحضرتؐ پر احکام خداوندی وحی کے وسیلے سے نازل ہوئے تھے اس لئے متصوفین نے حضورؐ کو بھی صوفی تصور کیا اور قرآن حکیم کی بعض آیات کریمہ میں تصوف کی صدا سننے کی کوشش بھی کی۔ ظہور اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمان تلاوت قرآن اس تسلسل سے کرتے تھے کہ ان پر آیات کا مفہوم کشف کے ذریعے واضح ہو جاتا۔ اسی کشف کی روشنی میں وہ اپنے اعمال و افعال کو استوار کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ حضرات حسن بصری، امام جعفر صادق، داؤد طائی، رابعہ بصری، ابراہیم ادہم اور حضرت ابو حنیفہ نعمان اپنے زمانے کے نامور صوفی شمار ہوتے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد قرب خداوندی اور تعمیل احکام ربانی کے لئے ذکر، فقر اور توکل کے نظریات بھی تصوف میں شامل ہو گئے۔ نوفلاطونی نظریات نے دنیا سے نفرت کا جذبہ پیدا کیا تھا۔ چنانچہ ترک خواہش کو بھی تصوف میں جگہ مل گئی نتیجہ یہ ہوا کہ تصوف کی رسوم مذہبی فرائض پر فوقیت حاصل کرنے لگیں اور مرشد کی ذات قرب خداوندی کے حصول کا وسیلہ بن گئی۔

تصوف کے اس رویے کے خلاف راسخ الاعتقاد حلقے میں ردعمل پیدا ہونا ایک نظری عمل تھا چنانچہ منصور حلاج کو چند غیر محتاط جملوں کے ادا کرنے پر لٹکا دیا گیا۔ دسویں صدی عیسوی میں تصوف پر شیعیت کے اثرات نے غلبہ پالیا اور نظریہ وحدت الوجود پر وحدت الشہود کو فوقیت حاصل ہونے لگی۔ چنانچہ متقدمین کئی فرقوں میں بٹ گئے جن سے، محاسبی جنیدی، اور ملامتی فرقے، زیادہ معروف ہوئے ابوسعید نے فنا اور بقا کی توضیح تصوف کے زاویے سے کی اور بالآخر ایسے انتہا پسند صوفیا منظر عام پر آگئے جنہوں نے حلول امتزاج اور تنسخ ارواح کے عقائد کو جزو ایمان و عمل بنا دیا اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ تصوف کی آزادہ روی قیود اور پابندیوں میں اسیر ہوگئی۔ منصور حلاج کو تصوف میں یہ اہمیت ہے کہ ابن عربی اور عبدالکریم الجیلی نے انہی کے نظریات پر اپنے تصورات کی اساس رکھی شاعری میں منصور کی بازگشت ابوسعید ابن ابوالخیر اور عمر ابن الفارض کی شاعری میں سنائی دیتی ہے۔

اسلامی تحریک کے آخری دور میں تصوف کے دو نظریوں کو بہت اہمیت حاصل ہوئی اولاً یہ کہ حقیقت مطلقہ نور اور مادہ ظلمات نور ہے ثانیاً یہ کہ حقیقت مطلقہ محض خیال ہے اور یہ کائنات کے ہر ذرے میں ظاہر ہے، اول الذکر نظریے کی تبلیغ شیخ شہاب الدین سہروردی نے کی اور انسانی روح کو نور کے مقام اعلیٰ تک پہنچنے کی ترغیب دی۔ موخر الذکر کو ابن عربی نے فروغ دیا اور جز ہے اور خدا کے درمیاں حد فاصل اٹھانے کی کوشش کی۔ ابن عربی کی کتاب فتوح المکیہ تصوف کی اہم ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے ان کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے وحدت الوجود کے مسئلے کو ذہنی اور استدلالی جامہ پہنا کر ایک فلسفہ بنا دیا عبدالکریم الجیلی نے تصوف کی ابتدائی سادگی پر خیالی تصورات کے تہہ در تہہ غلاف چڑھائے اور حقیقت مطلقہ کو ان پردوں میں چھپا دیا۔

تصوف کی تحریک بنیادی طور پر آزادہ فکری اور آزادہ خیالی کی تحریک تھی، راسخ الاعتقاد علمائے نے جنہیں بعض سلاطین وقت کی اعانت بھی حاصل تھی۔ اسلام کی سادگی کو سنگلاخ قیود میں پابند کرنے کی کوشش کی تھی۔ یزید اور اس کے بعد حجاج بن زیاد نے اسلام کی سادگی کو مجروح کیا اور شخصی حکومت کو جاہ و حشم کی نمائش کا وسیلہ بنا دیا۔ تصوف کی تحریک نے اس رویے کے خلاف رد عمل کا اظہار کیا اور بندہ اور آقا کے درمیان حائل پردوں کو ہٹا کر براہ راست قرب الٰہی حاصل کرنے کی سعی کی۔ چنانچہ تصوف میں ریاضت نے مذہب کی جگہ حاصل کرنی شروع کر دی۔ محبت خالصتہً جذبہ قرار دی گئی۔ رقص و نغمہ عبادت کا درجہ اختیار کر گئے، مطرب و ساقی، ہجر و وصال، عشق و عاشقی وغیرہ مشاہدۂ حق کی اصطلاحات بن گئیں۔ تصوف میں حرکت و عمل کم اور غنودگی اور خود فراموشی کی کیفیت زیادہ رہے۔ چنانچہ مشرقی ممالک میں جہاں فنا اور بقا کے تصورات عرصے سے قبول عام حاصل کر چکے تھے۔ تصوف کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اور عقلیت کی تحریک جو حقیقت کی ماہیت کو بھی تحلیل و تجزیہ سے معلوم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مغرب میں زیادہ پھیلی۔

یونانی فکر و فلسفہ کی حس رو نے مشرق وسطی کو متاثر کیا تھا اس کا طبعیاتی اثر مغرب میں ابن باجہ، ابن طفیل اور ابن رشد تک بھی پہنچا۔ البتہ فرق یہ ہے کہ مشرق وسطی میں افلاطونی اور اندلس میں نوافلاطونی نظریات کو فروغ حاصل ہوا۔ دونوں تحریکوں کو راسخ الاعتقاد علمائے کے شدید رد عمل کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم مشرق میں جہاں بھگتی اور ترک دنیا کا ایک خاص رجحان موجود تھا

امام غزالی اور ان کے رفقاء کو اہمیت ملی اور مغرب میں جہاں البرٹ اعظم تھامس ایکوی ناس اور ابیلارڈ وغیرہ نے مذہبی عقائد کے عقلی پہلو کو فروغ دیا تھا ابن رشد کا مطالعہ ذوق وشوق کے ساتھ کیا گیا چنانچہ فلپ حتیؔ نے عربوں کی تاریخ میں لکھا کہ

دور وسطیٰ کے مغربی متکلمین اور اہل قلم کے ذہنوں میں جتنا ہیجان ابن رشد نے پیدا کیا ہے اور کسی نے نہیں کیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ابن رشد کو مسلمانوں کی بہ نسبت عیسائیوں نے زیادہ اہمیت دی۔ مشرق میں مسلمانوں کی علمی شمع اب بجھ رہی تھی ابن رشد کی فکر انگیز تصنیفات سے اس شمع کی تابندگی میں اضافہ نہ ہو سکا۔ مغرب میں یورپی اقوام تاریکی کے خواب گراں سے جاگ رہی تھیں۔ اس لئے انہوں نے ابن رشد سے روشنی مستعار لی اور اپنی قندیلوں کو روشن کر لیا۔ اور یوں کلیسا کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں اور بندشوں کے خلاف عیسائی سینہ سپر ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ اہل کلیسا ابن رشد کے دشمن بن گئے اور اسے بے تحاشا گالیاں دینے لگے۔

اسلامی تحریک کا دور عروج ابن رشد سے بہت عرصہ پہلے اور عثمانی فتوحات کے فوراً بعد ختم ہو گیا تھا اور اب اس پر شدید ترین اضمحلال کے آثار ہویدا تھے اس دور زوال میں بھی ابن خلدون کی شخصیت اتنی فعال ہے کہ اسے ادب اور تاریخ کا کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ابن خلدون نے بکراں ماضی کے گم شدہ خزینوں کو کھنگالا اور تاریخ و عمرانیات کا ایک منضبط نظریہ پیش کر دیا۔ ابن خلدون سائنسی انداز فکر کا حامی تھا ابن رشد نے حقیقت دو گونہ کے جس نظریے پر ارسطو کی وساطت سے رسائی حاصل کی تھی ابن خلدون اس تک اپنے وضع کردہ نظریہ تاریخ سے پہنچا تھا۔ ابن خلدون اپنے عہد کے تعصبات سے بہت بلند تھا۔ اور عرب نژاد ہونے کے باوجود کہتا تھا کہ عرب تہذیب و تمدن کے دشمن ہیں اور اسلام میں علوم و فنون کے حامل اہل عجم ہیں۔

ابن خلدون کی عطا یہ ہے کہ اس نے عربی مزاج کی بدویت کو نشان زد کیا اور عقلی انداز نظر اور سائنسی فکر کی طرح ڈالی ابن خلدون نے تاریخ کی اس صداقت کو دریافت کیا جو ایک مسلسل دائرے کی صورت میں اس کے چاروں طرف بکھری پڑی تھی اس نے ان منتشر ذروں کو جمع کیا اور ان پر تحلیلی نظر ڈال کر تاریخ کا ایک نیا فلسفہ مرتب کیا یہ کارنامہ اتنا بڑا تھا کہ اس کی تعریف ٹائن بی نے بھی کی۔ ابن خلدون کو فلسفہ تاریخ کا پیش رو تسلیم کیا۔

دنیا کے معاشرے کو قریباً آٹھ سو سال تک حرکت و عمل کی قوت عطا کرنے کے بعد اسلامی تحریک پر اب تھکن کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ چنانچہ سولہویں صدی عیسوی سے انیسویں صدی عیسوی تک اسلامی تہذیب و تمدن، ثقافت اور فنون لطیفہ پر ایک خواب گراں طاری نظر آتا تھا اس دور میں کسی بڑی اور فعال تحریک کا نشان نظر نہیں آتا اس جمود میں کہیں کہیں مذہبی اختلافات کی لہر اٹھتی اور تموج پیدا کرتی دکھائی دیتی ہے لیکن اس سے پورا اسلامی معاشرہ یا بیرونی دنیا متاثر نہیں ہوئی نتیجہ یہ ہے کہ اس دور پر یکسانیت کا گہرا زیادہ نظر آتا ہے دوسری طرف مغرب میں انسان نے اپنی آنکھیں داخل سے ہٹا کر پھر کائنات پر مرکوز کر دی تھیں۔ سائنس کے نئے نئے انکشافات نے ایٹم میں چھپی ہوئی قوت کو دریافت کرنے کے لئے عملی تجربات شروع کر دیئے تھے۔ اور تخلیقی سرگرمیوں کا موکھ ایک مرتبہ پھر مشرق سے مغرب کی طرف منتقل ہو گیا تھا اس کا نتیجہ مغرب میں احیاء العلوم کی

تحریک تھا۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ احیاۓ العلوم کی اس تحریک کے پس منظر میں قرونِ وسطیٰ کی متذکرہ بالا زبردست اسلامی تحریک کی بازگشت موجود تھی اور ابن رشد اور ابن خلدون کے عقلی اور نظری تصورات نے ہی مستقبل کی تحریکوں کو مضبوط اساس فراہم کر دی تھی۔

ڈاکٹر محمد معز الدین

اسلام کی ترویج واشاعت میں اُردو کا حصّہ

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی نشو نما دراصل قدیم صوفیوں اور درویشوں کی روح پرور تعلیمات اور گرانقدر خدمات کا نتیجہ ہے یہ بے غرض مبلغ اسلام نہایت جانفشانی کے ساتھ دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں معروف رہے انہیں اس راہ میں بڑی بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ دور دراز کے سفر کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں مگر انہوں نے اپنے بے مثل اخلاق، زاہدانہ طرز زندگی اور میٹھے بول سے لوگوں کے دل موہ لیے، وسعت قلبی، انسان دوستی اور بلا تخصیص ذات و نسل خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ان بوریا نشینوں نے عوام کے دلوں پر حکومت کی۔ دل بدست آور کہ حج اکبر است پر صحیح معنوں میں عمل پیرا ہو کر دین کی خدمت کی۔ اپنی مخلصانہ اور بے لوث خدمت کے لیے انہوں نے وہاں کی مقامی بولیوں کا ذریعہ اظہار بنایا۔ بقول مولوی عبدالحق "دلوں کو ہاتھ میں لانے کے لئے سب سے پہلے ہمزبانی لازم ہے، ہمزبانی کے بعد ہم خیالی پیدا ہوتی ہے۔"

اُردو زبان کی ابتدا ساخت، اشتقاق، ترقی اور ماحول کی بحث میں پڑے بغیر ہم یہ آسانی سے تسلیم کر سکتے ہیں کہ بادشاہوں سے بڑھ کر ہمارے صوفیائے کرام نے اس زبان کو فروغ بخشا ہے اور جس وقت اس کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں اس وقت سے اسے اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ غرض یہ کہ ابتدائی دور سے اشاعت اسلام میں اردو کا جو حصہ رہا ہے وہ ہمارے لئے قابل فخر بھی ہے اور دعوت عمل بھی۔

اردو زبان برصغیر پاک و ہند میں اپنی ترقی کے مختلف مدارج میں اور مختلف خطوں میں مختلف ناموں سے پکاری جاتی رہی ہے پھر مقامی اثرات کے تحت لہجے اور الفاظ کا اختلاف بھی رہا ہے کہیں کھڑی بولی، کہیں پوربی کہیں گوجری، کہیں دکنی کہلائی۔ عام اصطلاح میں ابتدائی دور میں ہندی کہلاتی رہی ہے۔ میر تقی میر، میر حسن اور مصحفی کے دور میں بھی ہندی اسے کہلائی، ان کے تذکرے مسمی گویان ہندی ہیں۔ غالب کے دور میں ریختہ کہلائی۔ مگر ناموں کے اس اختلاف کے باوجود جو اسلامی لٹریچر، مخصوص ابتدائی دور میں پیدا ہوا ہے وہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس زبان نے اسلام کی اشاعت میں ہر دور میں ساتھ دیا ہے۔ صوفیائے کرام کے ارشادات، ملفوظات اقوال اور منثور و منظوم رسائل تحریروں کے ذخیروں کے علاوہ اس دور تک اسلامی ادب کا ایک بے بہا خزانہ اب تک جمع ہو گیا ہے اور یہ اردو زبان کا کرشمہ ہے کہ اس کے چمن میں رنگا رنگ پھول کھلے ہیں جن سے ہمارے چمن کی زینت ہے! بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تصنیف "اردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا حصہ" پر سرسری نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بزرگان دین نے تبلیغ و اشاعت اسلام کے سلسلے میں مقامی زبان میں اپنی گفتگو سے لوگوں کے دلوں پر کتنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں جو اسلام کی ترویج میں بہت ممد و معاون ثابت ہوئے، ان صوفیائے کرام کی طویل فہرست ہے اور ان کی

چھوٹی بڑی تصنیفات اور دلپذیر کلام کا طولانی سلسلہ ہے۔
حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ پاک پٹن کے ہندی قول" پوتوں کا چاند بالا ہے" سے قطع نظر ان کے اشعار بھی ملتے ہیں مثلاً عشق کا رموز نیارا ہے، خیز مدد پیارے نہ چارا ہے، محمد شمیم دنپوی (بہاری) کے حوالے سے مولوی عبدالحق نے حضرت فرید شکر گنج کی ایک غزل بزبان ریختہ، کتاب مذکور میں دی ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے کہ

وقت سحر وقت مناجات ہے　　　　خیز دراں وقت کہ برکات ہے

اسی طرح شیخ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی وفات ۱۳۲۳ء نے اپنے شعر میں دوست کی جدائی کا حال اس طرح بیان کیا ہے

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روے
بدھن ایسی رین کو بھور کدھی نہ ہووے

ان اشعار و اقوال کے متعلق بعض اصحاب نے شبہ ظاہر کیا ہے اور ان سے منسوب قرار دیا ہے۔ اگر یہ ان حضرات کے اقوال و اشعار نہ بھی ہوں تب بھی اس سے یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اسلام کی ترویج و اشاعت میں اُردو زبان نے اپنے ابتدائی دور سے کتنی خدمت سرانجام دی ہے۔
حضرت امیر خسرو، سلطان الاولیا شیخ نظام الدینؒ متوفی ۱۳۲۴ء کے حلقہ چشتیہ سے فیض پانے والے صاحب دل اور صاحب کمال بزرگ تھے۔ حضرت امیر خسرو کو سرزمین ہند میں باضابطہ ریختہ کی بنیاد رکھنے والوں کا سامرا آدم قرار دیا جاتا ہے ان کی مشہور غزل کا ایک شعر درج ذیل ہے۔

شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

شیخ شرف الدین یحیٰ منیری (بہار) متوفی ۱۳۷۱ء صوفی بزرگ تھے ہندی اور بھاشا کے شاعر، دین اسلام کے فروغ میں بڑا کام کیا۔ ان کا مزار مرجع خاص و عام ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا ان صوفیائے کرام کے کارناموں اور تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے جو مولوی عبدالحق صاحب کے مذکورہ کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے جن میں حضرت گیسو دراز کا رسالہ معراج العاشقین، شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی کتاب رشد نامہ تصوف اور وحدت الوجود کے نقاط پر بہایت جامع تصنیف ہے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوری مکہ سے تشریف لائے اور یہاں کی زبان میں رشد و ہدایت کی روشنی پھیلائی۔ شہادت الحقیقت یا شہادت التحقیق ان کی مشہور تصانیف ہیں شرح مرغوب القلوب نثر میں ہے۔ توبہ طریقت حقیقت، ترک دنیا، فنا، بقا وغیرہ مضامین پر ایمان افروز لٹریچر کا بڑا ذخیرہ ان کی بدولت اس زبان میں پیدا ہو گیا ہے۔ حضرت گیسو دراز کے فرزند شاہ برہان الدین کی تصانیف نسیم الکلام منفعت الایمان وصت الہادی سکھ سہیلا، تصوف و سلوک پر مبنی یہ نہایت اہم رسالے ہیں۔ انہیں کا رسالہ کلمۃ الحق نثر میں ہے۔

یہ چند نام مشتے از خروارے کے طور پر پیش کئے گئے ہیں ان کے ارشاد و اقوال کے ذریعہ جو زبان اردو میں تھے اسلام کی بے پناہ خدمت ہوئی ہے۔ ان کے بعد سید احمد سرہندی ملقب بہ مجدد الف ثانی کی احیائے دین کی کوشش کے نتیجے میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور مولوی عبد الحق محدث دہلوی نے قرآن و حدیث کی اشاعت کے ذریعہ اسلام کی جو بے پناہ خدمت کی ہے وہ ناقابل فراموش ہے ان اکابر کی بدولت مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ اور اجتہادی فکر دونوں کا عمل جاری و ساری رہا۔ ان کے علاوہ ولی دکنی سے لے کر غالب و میر و مومن کے دور تک جتنے اردو کے شعرائے کرام گذرے ہیں، ان کے یہاں حمد و نعت اور منقبت کی صورت میں جو اشعار موجود ہیں وہ بھی اس سلسلے کی کڑیاں شمار ہوں گی۔ خاص طور سے خواجہ میر درد اور مظہر جان جاناں کے کلام کا معتد بہ حصہ اسی سلسلے کا ہے۔ پھر اس دور میں حضرت علامہ اقبال تو سراپا شاعر اسلام بن کر آئے اور ان کے کلام اور ان کی نثری تحریروں سے ہم طلوع اسلام کے نشاۃ الثانیہ کے دور میں آ گئے وہ اسلام کے سب سے بڑے نقیب اور علمبردار ہیں ان سے اردو زبان و کلام کو نیا آہنگ اور نیا اعتبار مل گیا

شب گریزاں ہوگی آخر جلوہ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمہ توحید سے

ان سے پیشتر سر سید احمد خاں کے کارنامے اور ان کے رفقائے کار مولانا شبلی نعمانی کی تصانیف علم الکلام مولانا سید سلیمان ندوی سیرت النبیؐ انہیں علامہ اقبال نے علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد کہا تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کی تصانیف اسلامی ادب کا گرانقدر سرمایہ ہیں۔ اردو زبان ادب بے مایہ نہ رہی بلکہ دنیا کی بڑی سے بڑی زبان سے آنکھیں ملا کر اپنا مقام منوا لیا ہے۔ اس سے پہلے قرآن حکیم کا پہلا اردو ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے شاہ عبد العزیز نے کیا ڈپٹی نذیر احمد مولانا رضا بریلوی اور مولانا فتح محمد جالندھری کے ترجمے خاص طور پر قابل تعریف ہیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد کا ترجمان القرآن مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں مختلف خانقاہوں، اسلامی اور ثقافتی اداروں اور معارف اسلامیہ، جرائد و رسائل مثلاً معارف اسلامیہ، معارف وغیرہ کے ذریعے زبان اردو کے ذریعہ یہ سلسلہ قائم اور قابل صد تحسین ہے۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا اردو ترجمہ، زیر اہتمام ڈاکٹر سید عبد اللہ کا اس باب میں نہایت اہم کارنامہ ہے غرضیکہ اسلام کی ترویج و اشاعت میں اردو نے وہ کام کیا ہے کہ شاید ہی کسی اور زبان نے اتنے کم عرصے میں اتنا کام سر انجام دیا ہو۔

پروفیسر ادیب صابر

اردو زبان اور قومی تقاضے

پاکستان کی قومی زبان اردو ہے یہ دنیا کی بہترین ترقی یافتہ زبانوں میں سے ایک ہے اس میں دفتری، تعلیمی اور سائنسی زبان بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ ان حیثیتوں میں اسے آزمایا اور برتا جاچکا ہے۔ پاکستان میں اردو کے نفاذ کے راستے اردو کی کم مائیگی حائل نہیں ہے۔ ملائی، چینی اور جاپانی اردو کی نسبت کم ترقی یافتہ زبانیں ہیں وہ بھی سائنسی، دفتری اور تعلیمی حیثیت سے برتی جارہی ہیں۔ اور قومی ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی کررہی ہیں۔

اردو کے نفاذ کے راستے میں اصل رکاوٹ ہماری قوم کا بالائی طبقہ رہا ہے یہ طبقہ، انگریزوں کے سائے میں پلا بڑھا اور پھلا پھولا ہے اردو کے عروج سے اس طبقے کو زوال کا خوف ہے۔ لہٰذا جب تک اس طبقے کا زور چلے گا، انگریزی کی بالادستی قائم رہے گی۔ اس کی اگلی نسلیں بھی انگریزیت کے ماحول میں پروان چڑھ رہی ہیں۔ ملک میں یہ ایک فعال اور نامی قوت ہے اس کا توڑ زندہ، فعال اور نامی قوت ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ قوم کے اس بالائی طبقے کو قومی استحکام و ترقی سے زیادہ عزیز اپنی حفاظت اور اپنا استحکام ہے۔ قومی زبان کا یہ مخالف طبقہ اسلامی تہذیب کا مخالف بھی ہے وہ قوم، اس کے لقب لعین اور اسکی امنگوں سے الگ تھلگ اپنی دنیا آباد کئے ہوئے ہے اس کی عیاشی قوم کی بربادی اور اس کی قوت قوم کی بےبسی کے مترادف ہے۔ قومی وسائل پر بیشتر اس کا تصرف ہے، اختیار و اقتدار کے عہدوں پر وہ فائز چلا آتا ہے حکومتیں بدلتی رہتی ہیں لیکن وہ قائم و دائم ہے اس طبقے کے ارادوں اور چالوں کو سمجھنے اور ان کا توڑ کرنے کی ضرورت ہے۔ وسیع پیمانے پر زبان و قلم کے جہاد کے ذریعے یہ حقیقت عوام کے ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ انگریزی کے تسلط سے ملک کو کتنا بڑا نقصان پہنچا ہے اور اس کی جڑیں کس طرح کھوکھلی ہوتی رہی ہیں۔ ہم پوری قوم کو ساتھ لے کر ہی انگریزیت کے بھوت کا خاتمہ کرسکتے ہیں یہ زور دست و ضربتِ کاری کا مقام ہے عصانہ ہو تو کلیمی کاپورے بنیاد ثابت ہوتا ہے۔

قائداعظم اور قائد ملت قومی زبان کی اہمیت جانتے تھے ان کے بعد ہمارے سابقہ حکمرانوں نے قوم پر ایک ظلم تو یہ کیا کہ لینگوا فرینکا قومی زبان اردو کے مقابلے میں ایک علاقائی زبان بنگلہ کو بھی قومی زبان تسلیم کرلیا، مقصد انگریزی کا سکہ رواں رکھنا تھا مشرقی پاکستان اردو سے دور ہوتا گیا ایک الگ قوم کی داغ بیل ڈالی ۔ ۱۹۶۲ء میں طے کیا گیا کہ دس برس کے بعد ایک کمشن قائم کیا جائے گا جو یہ فیصلہ کرے گا کہ انگریزی کی جگہ کون سی قومی زبان ملک کی مرکزی اور سرکاری زبان بن سکتی ہے اس طرح دس برس کے لئے انگریزی کا اقتدار یقینی بنالیا گیا۔ ۱۹۷۲ء سے پہلے بنگلہ زبان کی بدولت بنگلہ دیش کا قیام عمل میں آگیا اور کمشن کے قیام کی نوبت ہی نہ آئی۔

اب صورت حال یہ ہے کہ پاکستان کی واحد قومی زبان اردو ہے۔ اردو کے نفاذ سے بنگالیوں کے شور کا اندیشہ باقی نہیں ہے پاکستان کی مختلف علاقائی زبانوں میں سے بھی کسی کا دعویٰ قومی زبان بننے کا نہیں ہے بلکہ ملک کے اکثر صوبے بھی اُردو کو

سرکاری زبان بنانے کا اعلان کر چکے ہیں : تین برس پیشتر پہلی جماعت سے انگریزی سکولوں کے لئے بھی انگریزی کی جگہ اردو کو ذریعہ تعلیم
بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس فیصلے کی رو سے ۱۹۸۹ء سے میٹرک کا ۱۹۹۲ء سے بی اے بی ایس سی کا امتحان صرف اردو میں ہوا
کرے گا۔ مقتدرہ قومی زبان کی تشکیل بھی ایک اہم اقدام ہے۔ مقتدرہ کی باگ دوڑ ان ہاتھوں میں دی گئی ہے جو پاکستان میں اردو کے
نفاذ کے لئے کام کرتے رہے ہیں صدر ضیاالحق کے پاس اختیار کا جو عصا ہے وہ پاکستانی لباس اور قومی زبان کی حمایت
میں استعمال ہوا ہے۔ اگر وہ ہمت مردانہ سے کام لیتے ہوئے ایک قدم اور آگے بڑھیں اور دفتروں میں انگریزی کی جگہ،
اردو کے استعمال کا حکمنامہ جاری کردیں تو قومی نقطہ نظر سے یہ بہت اہم پیش رفت ہوگی۔ اس مقصد کے لئے ٹائپ رائٹروں
کا مسئلہ حل کرنا ضروری ہے۔ صورت حال کا تقاضہ یہ ہے کہ نجی اور سرکاری دونوں شعبوں میں ایسے کارخانے قائم کئے جائیں جہاں
اردو کے معیاری ٹائپ رائٹر تیار ہوسکیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ سول و فوجی ملازمتوں کے لئے انٹرویو اور تمام تحریری امتحانات
اردو میں لئے جائیں۔ اور سول سروس اکیڈمی اور مسلح افواج کے اکیڈیمیوں میں انگریزی کی جگہ اردو کو تعلیمی زبان کے طور پر برتا
جائے۔ یہ درست ہے کہ انگریزی کو بالکل ترک کردینا ہمارے قومی مفاد میں نہیں۔ انگریزی کافی حد تک بین الاقوامی زبان ہے
اور ایک حد تک ہمارا ثقافتی ورثہ بن چکی ہے۔ اصل مسئلہ انگریزی کے وجود کا نہیں اس کی بالادستی کا ہے۔ اسے اختیاری
مضمون کی حیثیت سے بہرحال نصاب میں رہنا چاہیئے۔ انگریزی کی لازمی تدریس کے سلسلے میں البتہ غور کرنا ضروری ہے۔
امتحانوں کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ طلباً کی اکثریت انگریزی میں فیل ہو جاتی ہے اس طرح نوجوانوں کا وقت ضائع ہوتا
ہے اور ان کی شخصیت پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں انگریزی کی لازمی تدریس قومی مفاد میں نہیں ہے اگر ہو بھی تو میرے خیال
میں صرف چار برس کے لئے ہونی چاہیئے۔ چار برسوں کے لئے عربی کو بطور لازمی مضمون پڑھایا جائے ہمارے زیادہ اقتصادی
روابط عرب دنیا سے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم پاکستان میں اسلامی معاشرے کے قیام کی جد و جہد میں مصروف ہیں عربی کی لازمی تدریس
ہمارے لئے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ سرکاری دفتر اور تعلیمی زبان کی حیثیت سے اردو کا نفاد قومی یکجہتی، ملکی استحکام اور اسلامی
مساوات کے فروغ کا باعث بنے گا۔ ہمارے بالائی طبقے سمیت پوری قوم کے افراد کے لئے یکساں مواقع پیدا ہو جائیں گے اعلیٰ ملازمتوں
پر ایک طبقے کی اجارہ داری ختم ہوسکے گی اور عوام کے لئے معاشی عدل و انصاف کا دروازہ کھل جائے گا انگریزیت کا غیر ملکی قلعہ مسمار ہو
جائے گا اور علاقائی عصبیتوں کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ قوم کا ضمیر اور احساس ایک ہو جائے گا۔ اور اس کے شعوری ارتقا میں یکسانیت پیدا
ہوسکے گی پوری قوم ایک مشترک زبان کے باعث مشترکہ قومی کلچر کو فروغ دے گی علم اور طالب علم کے درمیان انگریزی کی دیوار گر
جائے گی ملک میں سائنسی ماحول پیدا ہوگا اور ہم اس شاہراہ پر گامزن ہوسکیں گے۔ جو قومی استحکام اور ترقی کی شاہراہ ہے جو لوگ
قوم کی بقا چاہتے ہیں اور اس کی ترقی و خوشحالی کے خواہشمند ہیں اور پاکستان کو ملت اسلامیہ کی تعمیر نو میں اہم کردار ادا کرتے
ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں انہیں قومی زبان کے نفاذ کے لئے کوششیں تیز تر کردینی چاہئیں۔

اردو ادب میں ترویج میں

فارسی کی اہمیت

ڈاکٹر عبادت بریلوی سابق پروفیسر و صدر
شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی پرنسپل اورینٹل کالج لاہور

برعظیم ہند و پاکستان کی ثقافتی زندگی کے نشیب و فراز کی کہانی درحقیقت فارسی زبان کے نشیب و فراز کی کہانی ہے۔ تقریباً ایک ہزار سال تک اس سرزمین پر فارسی کا پرچم لہراتا رہا ہے اور اس نے نہ صرف کشور تہذیب و ثقافت بلکہ دلوں کے اقلیم پر بھی حکمرانی کی ہے۔ شاہان وقت آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ ان کی ہیبت و جبروت سے یہ زمین زیر و زبر ہوتی رہی ہے ان کی قسمتوں کے ستارے طلوع ہو کر غروب اور غروب ہو کر طلوع ہوتے رہے ہیں لیکن فارسی زبان اور ادب کے آفتاب اور ماہتاب اس سرزمین پر کبھی گہنائے نہیں بلکہ تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ان کا اقبال روزافزوں رہا ہے۔

غزنوی اور غوری کے زمانے سے فارسی زبان نے اس سرزمین پر اپنے اقتدار کا پرچم لہرایا اور یہی حکومت کا سکہ چلایا اور خلجیوں، تغلقوں، لودھیوں، سوریوں اور مغلوں کے دور آخر تک یہ زبان تخت سلطنت پر جلوہ افروز رہی اور کوئی اس کی حکمرانی کو ہلانے اور اس کے اقتدار کو متزلزل کرنے کا خواب بھی نہ دیکھ سکا۔

یوں تو فارسی زبان اور ادب نے اس سرزمین پر مغلوں سے قبل بھی ترقی کی منزلیں طے کی ہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس سرزمین پر مغلوں کا دورِ حکومت اس زبان و ادب کے شباب کا زمانہ ہے اس زمانے میں فارسی کے ایسے ایسے شاعر اور نثرنگار یہاں پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی علمی اور تخلیقی کاوشوں سے نہ صرف برعظیم ہند و پاکستان اور ایران بلکہ سارے جہاں سے اپنا لوہا منوا لیا۔ اور جو اپنی ادبی و شعری تخلیقات کی وجہ سے رہتی دنیا تک فارسی ادب کی روایت کے افق پر آفتاب اور ماہتاب بن کر جگمگاتے رہیں گے۔

یہ صورت حال اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ فارسی زبان صرف حکومت ہی کی زبان نہیں رہی اس نے سرکاری اور علمی سطح ہی پر کارہائے نمایاں انجام نہیں دیئے بلکہ دلوں میں بھی اپنی جگہ بنائی اور اس سرزمین کے رہنے والے اس کی زلف گرہ گیر کے ایسے اسیر ہوئے کہ اس کے بغیر ان کی زندگی نامکمل بلکہ بے معنی نظر آنے لگی۔ مغلوں کے دورِ آخر یعنی اورنگزیب عالمگیر کے وقت تک یہی صورت حال رہی۔ اس کے بعد محمد شاہی دور میں اس صورت حال میں تھوڑا سا فرق ضرور پیدا ہوا کیونکہ اس زمانے میں فارسی زبان کے ساتھ اُردو زبان نے بھی ایک مستقل صورت اختیار کر لی اور اس میں نہ صرف بات کرنے بلکہ شعر و ادب کو تخلیق کرنے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا لیکن فارسی کا اثر اس زمانے میں بھی کم نہیں ہوا وہ اس زمانے میں بھی سرکاری اور علمی زبان رہی اور اُردو ادب و شعر کی تخلیق کے ساتھ ساتھ فارسی ادب و شعر کی تخلیق کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ فارسی کے شاعر اور ادیب اس

زمانے میں بھی پیدا ہوتے رہے اور نہ صرف یہ بلکہ اردو کے شاعروں نے اردو کے ساتھ فارسی میں بھی اعلیٰ درجے کی شاعری کی انہوں نے صرف اردو ہی کے دیوان مرتب نہیں کئے، فارسی کے دیوان بھی مرتب کئے۔ چنانچہ مرزا مظہر جان جاناں، خواجہ میر درد، مرزا رفیع سودا، میر تقی میر اور آگے چل کر مصحفی، میر حسن، غالب، مومن، شیفتہ، آزردہ اور ظفر کا فارسی کلام، باقاعدہ دواوین و کلیات کی صورت میں ملتا ہے ان میں سے بعض کے فارسی دیوان چھپ کر شائع بھی ہو چکے ہیں لیکن بعضوں کے دیوان ابھی شائع نہیں ہوئے وہ قلمی نسخوں کی صورت میں محفوظ ہیں ان شعرا نے نہ صرف یہ کہ فارسی زبان میں شاعری کی بلکہ جب بھی شعرا کے تذکرے لکھے یا ادبی و شعری معاملات پر قلم اٹھایا تو جو کچھ لکھا وہ فارسی میں لکھا۔ چنانچہ میر کے تذکرے نکات الشعرا سے لے کر شیفتہ کے گلشن بے خار کوئی تذکرہ اردو میں نہیں لکھا گیا۔ میر کا نکات الشعرا، قدرت اللہ قاسم کا مجموعہ نغز، فتح علی حسینی گردیزی کا تذکرہ ریختہ گویان، قائم کا مخزن نکات، میر حسن کا تذکرہ شعرائے اردو، مصحفی کا تذکرہ ہندی گویاں ریاض الفصحا، اور عقد ثریا آزردہ کا تذکرہ شعرائے اردو شیفتہ کا گلشن بے خار۔ سب فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ اور فارسی بھی ایسی جس کو پڑھ کر منہ میں شہد و شکر گھلتے اور کانوں میں نغمے گونجتے ہیں اور تذکروں ہی پر کیا موقوف ہے۔ میر نے اپنی آپ بیتی، ذکر میر اور اپنی کہانیوں کی عجیب و غریب کتاب فیض میر، مصحفی نے اپنی سوانح مجمع الفوائد، خواجہ میر درد نے تصوف کے موضوع پر اپنے رسالے نالۂ درد، آہ سرد، تصویر درد، حرمت غنا وغیرہ، مرزا مظہر جان جاناں اور مومن اور شیفتہ نے اپنے خطوط فارسی ہی میں لکھے ہیں اس میں کسی قسم کی شعوری کوشش یا تصنع اور بناوٹ کو دخل نہیں تھا۔ اس زمانے میں وسیلۂ اظہار یہی زبان تھی۔ افراد کے اندر ایک ایسی کیفیت تھی کہ جب وہ کوئی اظہار کرنا چاہتے تھے تو وہ اظہار فارسی میں ہوتا تھا۔ گویا فارسی افراد کے مزاجوں میں داخل تھی۔ دلوں میں اس کا بسیرا تھا اور تہذیب و ثقافت نے اس کو افراد کی شخصیتوں کا لازمی جز بنا دیا تھا۔

اس صورت حال کے اثرات اردو زبان پر بہت گہرے ہوئے اور اس کی ترویج میں فارسی نے نمایاں کردار ادا کیا اور اس پر گہرے نقوش چھوڑے۔ اردو زبان کی ساخت، اس میں شبہ نہیں، کہ ہندی ہے لیکن یہ صورت صرف افعال میں ظاہر ہوتی ہے جہاں تک اس زبان میں استعمال ہونے والے الفاظ کا تعلق ہے، وہ ۸۰، ۸۵ فی صد فارسی کے الفاظ ہیں۔ اس لئے فارسی کی پوری فضا اس زبان میں موجود ہے اور یہ فضا صرف فارسی الفاظ کے استعمال ہی سے پیدا نہیں ہوئی ہے اس میں اس تہذیب و ثقافت کا ہاتھ ہے جس نے فارسی کو پیدا کیا تھا اور یہ سب کچھ کسی کی شعوری کوشش سے نہیں ہوا۔ یہ تو ایک تاریخی ضرورت تھی ہمارے بعض لکھنے والوں نے خاص طور پر مولانا محمد حسین آزاد نے کئی جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اردو کو ہندی معاشرے اور ماحول کے سانچے میں ڈھلنا چاہیئے تھا۔ لیکن اس برعظیم کی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی تاریخ کو سامنے رکھا جائے تو اس خیال کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی جو قوم فارسی کو اپنی تہذیب و ثقافت کا محور بنا کر اس سرزمین پر فاتح کی حیثیت سے آئی اور اس کے زیر اثر جو لسانی اور تہذیبی رجحانات پیدا ہوئے ان میں فارسی زبان اور کلچر کے رنگ و آہنگ کا پیدا ہونا لازمی تھا یہی وجہ ہے کہ اردو زبان و ادب کے ہر دور میں فارسی کے اس رنگ و آہنگ کو معیار تصور کیا گیا ہے اور جب بھی اس میں

کوئی نئی لسانی تحریک چلی ہے اور جب بھی کوئی نیا ادبی اور شعری رجحان پیدا ہوا ہے تو اس کی تہہ میں فارسی کو سطح پر لانے اور کسی نہ کسی طرح اس سے استفادہ کرنے کے خیالات ضرور رونما ہوتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ اردو زبان اور ادب کے ہر رجحان اور ہر تحریک نے مختلف زاویوں سے یہ استفادہ فارسی سے کیا ہے۔

اُردو شاعری کی تاریخ میں دکن کا دور ایک ایسا دور ہے جس میں ہندی اور بھاشا کے اثرات خاصے نمایاں نظر آتے ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ سے لے کر کم و بیش ولی کے زمانے تک دکن کی اُردو شاعری میں ہندی کا یہ اثر نمایاں رہا ہے اس کے نتیجے میں غزل کی صنف نے ترقی نہیں کی ہے وہاں تو صرف مثنویوں کا رواج رہا ہے اور جس زبان میں یہ مثنویاں لکھی گئی ہیں اس میں مقامی اور ہندی فضا کے اثرات نمایاں ہیں۔ ولی کے زمانے میں اس صورت حال میں تبدیلی ہوئی۔ شعرائے اُردو کے مختلف تذکروں میں یہ لکھا ہے کہ جب محمد شاہی عہد میں ولی دکن اور گجرات سے دلی پہنچے اور اپنی ایسی غزلیں جس میں ہندی، روایت کے اثرات نمایاں تھے، مختلف محفلوں میں سنائیں تو اس زمانے کے ایک صوفی بزرگ شیخ سعد اللہ گلشن نے انہیں فارسی سے استفادہ کی طرف توجہ دلائی اور کہا کہ "ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختہ خود بہ کار ببر از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت"۔ یعنی یہ بے شمار فارسی کے مضامین جو بے کار پڑے ہوتے ہیں تو اپنی شاعری میں ان کو کیوں استعمال نہیں کرتا۔ تجھ سے ان کا کون حساب لے گا۔ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ ولی پر شاہ گلشن کی اس نصیحت کا گہرا اثر ہوا اور انہوں نے اس پر عمل کیا چنانچہ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کی غزلوں کے ایک بڑے حصے میں فارسی کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں اور مجموعی طور پر اسی لیے ان میں رنگینی، رعنائی اور رچاؤ کی وہ خصوصیات دکھائی دیتی ہیں جو فارسی زبان اور ادب کے ساتھ مخصوص ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو زبان کی تاریخ اصلاح زبان کی مختلف تحریکات و رجحانات کی تاریخ ہے۔ اس زبان میں ڈھائی سو سال کی تاریخ میں جتنی تحریکیں بھی چلی ہیں اور ان کے نتیجے میں یہ زبان جتنے بھی نئے رجحانات سے آشنا ہوئی ہے، ان سب میں فارسی زبان کے اثرات زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ فارسی نے اس زبان کے لئے شمع راہ کا کام کیا ہے اور اس کی روشنی میں اس نے اپنے سفر کی بے شمار ارتقائی منزلیں طے کی ہیں۔ دکن میں ولی کی شاعری اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ اس نے فارسی کا سہارا لے کر اردو زبان اور صنف غزل کو ایک نئی زندگی بخشی اور پھر ولی کی اس کوشش نے اس کو ایک تحریک بنا دیا اس کے بعد شمالی ہندوستان میں شاہ حاتم اور شاہ مبارک آبرو نے فارسی کا سہارا لے کر اردو زبان کو حتی الامکان نکھارنے کی کوشش کی۔ پھر آگے چل کر میر، سودا اور درد نے فارسی کے اثر سے اس کی دنیا ہی بدل دی اور اس طرح انہوں نے عہد کو اُردو شاعری کا عہد زریں بنا دیا۔ لیکن فارسی زبان اور ادب کے اثرات کا شباب تو غالب، مومن، شیفتہ، ذوق اور ظفر کے عہد میں نظر آتا ہے اس زمانے میں اردو شاعری میں باعتبار مضامین جو وسعتیں پیدا ہوئی ہیں اور جمالیاتی اظہار میں جو رنگینی اور رعنائی رونما ہوئی ہے اس میں فارسی زبان اور اس کی شاعری کے اثرات پوری طرح نظر آتے ہیں اور انہی اثرات کا یہ نتیجہ ہے کہ اس زمانے کی شاعری

ہیں گل و گلزار سے مسکراتے اور جھاڑ فانوس سے جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ غالب اور مومن کی شاعری اس صورت حال کی صحیح ترجمانی اور عکاسی کرتی ہے۔

بسویں صدی میں اس رجحان کی سب سے اچھی مثال علامہ اقبال کی شاعری ہے۔ غالب اور مومن کی طرح علامہ اقبال نے بھی فارسی کی روایت سے اکتساب نور کیا ہے اور اپنی شاعری میں فنی اور جمالیاتی اعتبار سے رنگ و نور کے ایسے دریا بہائے ہیں کہ اس میں مجموعی طور پر ایک چراغاں کی سی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ علامہ اقبال کی فکر بلند اردو میں فارسی کے توسط سے صحیح ابلاغ، اور جمالیاتی اظہار سے آشنا ہوئی بلکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ان کی فکر کے تیز دھارے نے اردو کی حد بندیوں کو توڑ دیا ہے اور وہ فارسی کے عظیم ظرف میں سما گئی ہے چنانچہ ان کی فکری اور فلسفیانہ شاعری کا خاصا بڑا حصہ فارسی میں ہے اور یہ فارسی کی عظمت اور اہمیت کی دلیل ہے۔ علامہ اقبال کے ساتھ ساتھ شاعری میں رومانی تحریک کے علمبرداروں جوش ملیح آبادی حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، روش صدیقی اور ساغر نظامی وغیرہ نے بھی فارسی کی روایت سے اپنی شاعری کو رنگین اور پرکار بنا کر اس میں دل موہ لینے والی کیفیت پیدا کی ہے۔ اور نثر میں رومانی تحریک کے علمبردار شبلی، مہدی افادی، ابوالکلام آزاد، سجاد انصاری نیاز فتح پوری، رشید احمد صدیقی، لطیف الدین احمد بھی اپنی اپنی نثری تحریروں میں فارسی کے اثر سے رنگینی، ارتقاء اور پرکاری کو پیدا کر کے ایک نئے اسلوب کا سنگ بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

فارسی کی اس ساحری کا اثر آج بھی ہمارے آس پاس اور گرد و پیش مختلف زاویوں سے اپنی جھلک دکھا رہا ہے اردو کی نئی شاعری اگرچہ اپنے بے شمار عوامل اور محرکات کی وجہ سے آج ایک خواب پریشاں بن کر رہ گئی ہے لیکن اس کے باوجود اس نئی شاعری کے اہم علمبرداروں کے یہاں فارسی کی وہ روایت اپنے شباب پر نظر آتی ہے جس کو غالب، مومن، اقبال اور جوش نے انتہائی بلندیوں سے ہمکنار کر دیا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ ان کے ہاں شاعری کا وہی رچا ہوا اسلوب دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے جس کی روایت تو اردو شاعری میں بہت پرانی ہے لیکن جس نے انیسویں صدی میں اپنے آپ کو انتہائی بلندیوں سے ہمکنار کیا ہے۔ فیض، راشد، مجاز، اور ان کے بعض ہم عصروں کی شاعری اس کی صحیح آئینہ دار ہے۔ ناول اور افسانے میں اس رجحان کے علمبردار علی عباس حسینی، کرشن چندر اور عصمت چغتائی ہیں اور تنقید میں ان کی نمائندگی پروفیسر رشید احمد صدیقی آل احمد سرور، پروفیسر سید احتشام حسین اور پروفیسر وقار عظیم کی تحریریں ہی جو صرف اپنے موضوع ہی کے اعتبار سے اہمیت نہیں رکھتیں، اسلوب اور انداز بیان کے لحاظ سے بھی اہمیت رکھتی ہیں اور مجموعی طور پر ان کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ پڑھنے والے پر سرخوشی کا ایک بادل بن کر چھا جاتی ہیں۔

فارسی کی ساحری یوں تو آج بھی جاری ہے اور ہمارے جدید سے جدید لکھنے والے فارسی سے اپنی تخلیقات میں دل موہ لینے والی رنگینی اور پرکاری پیدا کرنے میں پیش پیش ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادھر کچھ عرصے سے ہمارا ادب ایک عجیب طرح کے انتشار سے دوچار ہے اس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں لیکن بنیادی سبب

تجربے کے جوش میں روایت سے بغاوت کا رجحان ہے۔ زندگی کے بحران نے نئی نسل میں بڑی حد تک اقدار دشمنی کے خیالات پیدا کر دیے ہیں اور وہ کسی حد تک زندگی کی دوڑ میں ماضی سے منحرف اور روایت سے باغی ہو گئی ہے۔ مغرب کے بعض منفی، رجحانات نے نئی نسل کی اس کیفیت کو کچھ اور بھی شدید کر دیا ہے۔ بعض نظریاتی اور علاقائی تعصبات کے ہاتھوں روایت کی بنیادیں متزلزل ہو گئی ہیں لیکن یہ عجیب بات نہیں ہے قوموں کی زندگی میں ایسے دور بھی آتے ہیں لیکن جلد ہی وہ اپنے آپ کو اس سے باہر نکال لیتی ہے اور روایت کی پاسداری کا احساس اس کے عمل میں زندگی کا تازہ اور درخشاں لہو دوڑا کر اس کو صحت مندی اور جولانی سے ہمکنار کرتا ہے۔

اردو زبان اور ادب کی ترویج میں فارسی شعرا کی روایت نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان کو شمع راہ بنایا جائے تو اس کے سفر کی یہ منزلِ دشوار بھی آسان ہو سکتی ہے!

دو مشکل اصطلاحات

ڈاکٹر سید احمد سپروفیسر ایم لطیف

ترقی پسندی اور رجعت پسندی

فکر کی مغربی دنیا میں تو ترقی اور ترقی پسندی کا مفہوم نسبتاً واضح ہے مگر پاکستان میں اس کے معنی مشکوک، مبہم اور غیر واضح ہیں اس طرح پاکستان میں جس میلان کو رجعت پسندی کہا جاتا ہے وہ بھی نظام فکر کے حوالے سے زیادہ معین اشخاص کے حوالے سے مذکور ہوتا ہے۔

ترقی اور ترقی پسندی کیا ہے؟ ترقی ایک حیاتیاتی اصلاح بھی ہے اور فکری بھی۔ حیاتیاتی اصلاح ڈارون کے انکشافات اور نتائج تجربہ پر مبنی ہے اور، فکری، اسی سائنسی تجربے پر تشکیل یافتہ زندگی کے ہر شعبے میں تغیر اور آگے بڑھنے کے اصول کا نام ہے۔

ترقی پسندی اس ادبی تحریک کا نام ہے جو مذکورہ بالا اصولوں کے حوالے سے قائم ہوئی مگر اس کا دائرہ پھیل کر مغرب کے سارے مادی سائنسی اور مشینی فکریات پر محیط ہوا اس کا اصل الاصول اور اس کی لپیٹ میں اجتماعیات کے قوانین بھی آ گئے اور خصوصیت کے ساتھ کارل مارکس اور اینگلز کے تصورات و نظریات اس کا جزو اعظم قرار پائے۔ انقلاب کا سب سے بڑا نعرہ اور طبقاتی کشمکش کی جدلیات اس کی اساس ٹھہرا۔

برصغیر میں ۳۶-۱۹۳۵ء میں اس کا غلغلہ بلند ہوا ملک راج آنند اور ان کے دوسرے دوستوں نے انگلستان میں وہ کر اس کی تنظیم کی جس کی شاخیں ہندوستان میں بھی منظم ہوئیں سید سجاد ظہیر نے اپنی کتاب روشنائی میں اس کی تفصیل لکھی ہے پہلی ترقی پسند کانفرنس کی صدارت پریم چند نے کی جس کے خطبے میں اس تحریک کا مفہوم اور اس کے اغراض و مقاصد کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ جمال ان کا یہ ہے:

۱) سچائی اور حقیقت کی ترجمانی

۲) زندگی اور کائنات میں حسن کا ادراک اور اس کی مصوّری

۳) انسان کی مادی خوشحالی اور فارغ البالی سے متعلق اقدار کا فروغ

۴) غلامی و محکومی کے خلاف جہاد اور استعمار کی مزاحمت

۵) توہم پرستی کی مخالفت

ان اغراض ومقاصد کے الفاظ کتنے معصوم اور پیارے ہیں اور قدرتی طور سے برصغیر کے اہل قلم کی بڑی بھاری اکثریت کو ان الفاظ کی کشش اپنی طرف کھینچ کر لے گئی۔ اور ایک بڑی وجہ اس تحریک سے دلچسپی کی یہ تھی کہ اس زمانے میں جس میں اس نے برصغیر میں جنم لیا آزادیِ ہند کی تحریک زوروں پر تھی اور اکثر ادیب اس کے حامی یا اس میں شریک تھے۔ لیکن ایک خرابی یہ ہوئی کہ اس میں وہ لوگ بھی شامل سمجھے گئے جو دراصل ترقی پسندی کے معاشی فکر سے بے خبر یا بے تعلق تھے لیکن چونکہ وہ روایت اور قدیم ادب کے خلاف عام جدتوں یا بغاوتوں کے مدعی یا علمبردار تھے (اور قدیم ادب کی اس اخلاقیت کے بھی مخالف تھے جو اس میں تصوف یا مذہب کے راستے سے آگئی تھی) لہٰذا وہ بھی ترقی پسند کہلائے۔ اور چونکہ اخلاقی بگروں کی حمایت یا اظہار ان کا بھی طغرائے امتیاز تھا اس لئے ساری وضاحتی کوششوں کے باوجود ترقی پسندی، عام روایت کے علاوہ بے اخلاقی، جنس زدگی اور دین ومذہب سے بغاوت کی مترادف اصطلاح بن گئی اور جب آزادی مل گئی تو اس کا وہ جاذبِ توجہ عنصر بھی معدوم ہو گیا جس کی وجہ سے کثیر تعداد میں لوگ اس میں شامل ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ ادب کی سطح پر، بھارت اور پاکستان کے دو جُدا جغرافیائی اور سیاسی منطقوں نے اس تحریک کی وحدت کو ختم کر دیا کیونکہ ادب کے جو نصب العین مقرر کر لیے گئے تھے ان کی رو سے دونوں ملکوں میں وطن اور زندگی کے تقاضے بھی جدا ہو گئے اور دونوں ملکوں میں اس تحریک کی مقبولیت کو قائم رکھنا مشکل بلکہ محال ہو گیا۔

اس وقت صحیح معنوں میں، کوئی منظم ترقی پسند تحریک کم از کم پاکستان میں موجود نہیں۔ اور بین الاقوامی سیاست کے پے بہ پے تغیرات نے، ترقی پسند کہلانے والے ہر شخص کے لئے مشکلات پیدا کر دی ہیں کیونکہ ملکی مفادات اور بین الاقوامی سیاست کے رخ مختلف سمتوں میں ہیں۔ لیکن اس سارے زوال کے باوجود یہ سمجھنا درست نہ ہوگا کہ وہ فکریات بھی ختم ہو گئی ہیں جو اس تحریک سے وابستہ تھیں حقیقت یہ ہے کہ ترقی پسندوں کی مضبوط تنظیم اور ان کے طریقۂ کار نے کم از کم چالیس برس تک اتنا موثر کام کیا کہ تحریک کی فکریات اور اس کے نعرے، اب ہمارے ملک کی تحریروں میں ایک مستقل محاورے کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ان میں خود لفظ ترقی بھی ایک محاورہ ہے اسی طرح انسانیت، سرمایہ داری، بورژوا اور امراء، مفادیت، استحصال، امپریلزم، وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو ہر تحریر میں کسی نہ کسی طور آ ہی جاتے ہیں۔

ان محاوروں کی حیثیت تسلیم۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے صحیح مفہوم کو سمجھے بغیر اور ان پر یقین رکھے بغیر عمومی استعمال نے ان کی معنویت کمزور کر دی ہے بلکہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ ترقی پسندی کی الگ تحریک کی انفرادیت ہی ختم کر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہر شخص ایک لفظ کو اپنے اپنے خاص خیالات کو (جو باہم متناقض بھی ہوتے ہیں) استعمال کرنا شروع کر دے تو ان کا تشخص اور وجود ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ہمارے ملک کی ترقی پسندی بھی اسی بحران سے گذری یا گذر رہی ہے کیونکہ صورت اب یہ ہے کہ وہ شخص بھی اب ترقی پسند سمجھا جاتا ہے جسے ترقی پسندی کے مرکزی فلسفے کا نہ علم ہے نہ اس کا اس پر یقین ہے

نتیجہ یہ ہے کہ اب ہر ملک کی ترقی پسندی، رو بزوال ہو کر اس نقطے پر آ گری ہے جو پچھلی صدی کے آخر میں آزادیِ فکر

الحاد اور لادینی اور فکری لاابالی پن کی صورت میں موجود تھا جس میں ایک طرف یہ طبقہ تھا اور دوسری طرف اہل دین جنہیں قدامت پسند کہا جاتا ہے۔

اب ہمارے زمانے میں اسی لفظ "قدامت پسندی" نے رجعت پسند کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اور الحاد اور لادینی کی سب قوتیں بظاہر نہ سہی مگر بباطن، اس کے خلاف جمع ہو گئی ہیں۔ لہٰذا اب ترقی پسند کا مفہوم بھی (عمومی حد تک) بدل گیا ہے اور قدامت پسندی کا مفہوم بھی مختلف ہو گیا ہے۔ اور صورت حال بالکل واضح نہیں اور کوئی بھی صحیح معنوں میں یہ نہیں بتا سکتا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ رجعت پسندی کا طنزیہ خطاب ترقی پسندی کے عروج کے وقت ان لوگوں کے لئے مخصوص تھا جو ترقی کے مادی نظریے کو تسلیم نہ کرتے تھے، اور طبقاتی کشمکش کے اس مفہوم کو تسلیم نہ کرتے تھے جو مارکس اور لینن نے اس کے لئے مؤثر کر رکھا تھا۔ لیکن زمانے کی حرکت نے ان لوگوں کو بھی اپنے خیالات میں ترمیم یا تعبیر نو پر مجبور کر دیا ہے جو قدامت پسند کہلاتے ہیں اب وہ بھی ترقی کے مادی حوالے کو تسلیم کرتے ہیں اور ان میں سے تقریباً ہر شخص یہ تسلیم کرتا ہے کہ جو زمانہ گذر گیا وہ واپس نہیں آ سکتا۔ اس لئے اس زمانے کی طرف رجعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن دینی فکر کے ترجمان جن میں علامہ اقبال صف اوّل میں ہیں، بار بار یہ اعلان فرماتے ہیں کہ ہمارے جملہ نظام فکر کا ماخذ اوّل قرآن مجید اور حضور رسالت مآبؐ کا اسوہ حسنہ ہے کیونکہ ان کے بقول

ع بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

یا
گر ہمی خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلم قوم کے فکری مزاج اور نظام کے لئے سارے جدید تغیرات کے معاملے میں انہیں مذکورہ ماخذ کی طرف رجوع لازم ہے۔ اب اس رجوع کو آپ رجعت بھی کہہ دیں تو کہہ سکتے ہیں لیکن رجعت پسند کے طعنے سے بچنا ہی منظور ہو تو رجوع پسندی سے بچ کر نکل جانا ممکن نہیں اگر مسلمان کہلا کر کوئی شخص رجعت پسند نہ بھی ہو تب بھی وہ رجوع پسند تو لازماً ہو گا۔

دراصل زمانہ بھی بڑی سخت قوت ہے یہ تغیر کو ابھارتی بھی ہے اور تغیرات میں ہمواری بھی پیدا کرتا ہے پاکستان میں یہ ہمواری یوں پیدا ہوئی کہ بڑے سے بڑے ترقی پسند بھی اعلانیہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم ہر معاملے میں رجوع قرآن و سنت کو مرجع نہیں مانتے وہ بھی اس رجوع کو ماننے پر مجبور رہیں اور مخالف سمت میں جو لوگ جدیدیات کو چھونا تک پسند نہ کرتے تھے اب تغیر کی کارفرمائیوں کو تسلیم کرنے پر مجبور رہیں (اقبال نے فرمایا ہر تغیر میں حفظ و ثبات کا ایک عنصر (قدامت) موجود ہو اس لحاظ سے ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے فاصلے بڑی حد تک کم ہو گئے ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں البتہ مفاداتی ماحولیاتی کیمپوں کی لڑائی جاری ہے جو قدرتی سی بات ہے۔ میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ پاکستان میں ایک نئے پلیٹ فارم کا بہت جلد ظہور ہو گا جس پر بزعم خویش ترقی اور بقول دیگراں رجعت آ مل بیٹھیں گے بلکہ باہم مل کر چائے پیا کریں گے۔

فتح محمد ملک

جدیدیت کے عصری رُوپ

گذشتہ ایک صدی سے ہمارے ادب میں روایت اور جدت کی بحث جاری ہے۔ حالی سے ظفر اقبال تک اور نذیر احمد سے انور سجاد تک قصۂ قدیم و جدید نسل در نسل پھیلتا اور ہر بیس پچیس برس بعد تازہ فکر و احساس کو جنم دیتا چلا آ رہا ہے آج ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو روایت سے بغاوت کی ایک مسلسل نشو نما پاتی ہوئی، تغیر دوست روایت نظر آتی ہے جو بات حالی اور آزاد کے زمانے میں باغیانہ تھی وہ ہمارے زمانے تک آتے آتے ادبی روایت کا حصہ بن کر رسمی اور روایتی ہو گئی جن میلانات اور رجحانات کو ہم آج نئے فکر و احساس کا ترجمان سمجھتے ہیں اور قدامت پسند ذہن جن سے آنکھیں چار کرنے سے خائف ہے وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی جدیدیت کی طویل روایت کا مسلمہ جزو قرار پائیں گے گویا جدیدیت ہر زمانے بلکہ ہر نئی پود کے ساتھ ایک نئی پہچان لے کر نمودار ہوتی ہے۔ ایک زمانے میں افادیت اور مقصدیت کو جدیدیت کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا پھر ایک وقت وہ آیا جب رومانیت اور تخیل پرستی جدیدیت کے نشان ٹھہرے۔ اس کے بعد ابہام، فحاشی یا ہنگامی خیالات کا اظہار روایت سے بغاوت کی علامت قرار پایا اور آگے چل کر سراسر ذاتی کنایات اور احساس و فکر کی نارسائی کو جدیدیت سے منسوب کر دیا گیا۔ ہر نسل کے ساتھ جدیدیت کی اس تازہ تر پہچان پر غور کریں تو کھلتا ہے کہ اصولاً جدیدیت کا ان میں سے کسی ایک چیز کے ساتھ کوئی لازمی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ ایک اضافی تصور ہے۔ جو ہر زمانے کے تہذیبی اور تخلیقی تقاضوں کے زیر اثر نئے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ نت نئے قالب میں ڈھلتی جدیدیت کی اساس نئے تجربات کی پکار پر لبیک کہنے کے جذبے اور بزرگوں کی سند اور مروجہ رسوم و قیود کو حتمی سمجھنے کی بجائے آزادی و اجتہاد کی روش اپنانے میں پوشیدہ ہے۔

گذشتہ ربع صدی کے دوران روایت سے انحراف کا یہ جذبہ نئے لسانی رابطوں اور پیکروں کی تلاش میں سکہ بند زبان پر تشدد کے عمل اور صوفیانہ طرز احساس کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ شعری اور لسانی روایت کی یہ تخریب ایک تعمیری رجحان ہے۔ یہ پیروی مغرب کے زیر اثر وجود میں آنے والی جدیدیت کے امکانات کو کھنگال لینے اور ان کی منطقی فروغ کا عمل ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ جدت کا رسیہ ذہن اب جدید ادب کی روایت میں روایتی ادب تخلیق کرتے چلے جانے کی بجائے علاقائی تہذیبی اور ادبی روایات سے اکتساب فیض پر کمر بستہ ہے چنانچہ جیلانی کامران "استانزے" میں شعر عجم اور مغربی شعریات کی پابندیوں سے رہائی کی تمنا میں "جذبات کو علاقائی شاعری کے طرز میں پیدا"[1] کرتے ہیں اور زاہد ڈار کی شاعری میں "پرانے لاہور کی علاقائی روایت"[2] کی کارفرمائی دیکھتے ہیں تو مختار صدیقی مروجہ اسالیب اظہار کی نارسائی سے بیزار ہو کر سی حرفی کے فنی قالب کو آزماتے ہیں۔ وسعت بیان کی تلاش اگر سرمد صہبائی کو کافی سے عہد وفا استوار

کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ تو ثروت حسین کو وائی کے حسن کا قدردان بتاتی ہے۔ مختصر یہ کہ آج جہاں سی حرفی، کافی اور وائی کی سی اصناف سخن اسی اہتمام کے ساتھ رواج پا رہی ہیں جس اہتمام کے ساتھ ایک زمانے میں سانیٹ، نظم معریٰ اور نظم آزاد کی سی سنسنی خیز تکنیکی اختراعیں متعارف ہوئی تھیں وہاں ظفر اقبال کے سے شاعر اردو کا بول بالا کرنے کے جذبے سے اردو کو پھر سے ریختہ بنا دینے میں کوشاں ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ علاقائی شعری اصناف اور روایات کی ترویج سے تو خیر اردو ادب کا دامن وسیع ہو رہا ہے مگر اردو زبان کو تین سو برس پیچھے لے جانے میں کونسی خوبی ہے!؟ — مروجہ اردو کی لسانی تخریب کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس سے سرزمین پاکستان میں اردو کی بہت دور تک پھیلی ہوئی جڑوں کی آبیاری کا عمل شروع ہو گیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہمارا شاعر یہ سفر ماضی میں نہیں بلکہ مستقبل کی جانب کر رہا ہو۔ شاید اسی لئے ظفر اقبال نے "گلا آفتاب" کو اردو مستقبل کا خواب نامہ قرار دیتے ہوئے دعویٰ کیا تھا کہ "جن چشموں سے اس زبان نے ابتدا میں توانائی حاصل کی تھی اور جو ایک مدت سے اس پر روک دیئے گئے تھے میں نے انہیں پھر سے رواں کر دیا ہے۔"

ہر چند اردو زبان کو اپنے اصل سرچشموں سے دور لے جانے کے عمل کو اصلاح زبان کا نام دیا جاتا ہے مگر فی الحقیقت حاتم سے لے کر ناسخ تک اردو زبان کی تطہیر و اصلاح میں خرابی کی ایک صورت بھی مضمر تھی۔ یہ اردو کو اس کے عوامی اور مقامی رنگوں اور ذائقوں سے محروم کر دینے کی شعوری کوشش بھی تھی۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری اپنے مضمون "اصلاح زبان اردو" میں لکھتے ہیں: حاتم سے پہلے ولی کے زمانے تک اردو میں بہت سے الفاظ مستعمل تھے۔ جنہیں حاتم نے غیر فصیح اور ناشستہ قرار دے کر چھوڑ دیا۔ حاتم کے بعد میر و مرزا نے ہماری زبان کو متروکات کے خس و خاشاک سے پاک کیا۔ ناسخ کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے الفاظ و محاورات کی ایک بڑی تعداد پر خط نسخ کھینچ دیا۔ اردو زبان کی اصلاح کرنے والوں میں وہ سب سے ممتاز ہیں[1]۔ لسانی تطہیر کے پہلے علمبردار حاتم، ولی کے شاگرد تھے۔ ابتدا میں اردو میں شعر کہتے تھے جو "مکروہ، رکیک اور مبتذل الفاظ و معانی کا مجموعہ تھی" مگر اصلاحی جوش میں آئے تو خود اپنے دیوان کا یہ حال نظر آیا۔

"ہر رطب و یابس کہ از زبان ایں بے زبان آمدہ۔ داخلِ دیوان قدیم بود، کلیات مرتب ساختہ شد[2]"، چنانچہ اپنے دیوان کو ابتذال سے پاک کر کے دیوان زادہ بنایا: "اکثر الفاظ را از نظر انداختہ و الفاظ عربی و فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد و روزمرۂ دہلی کہ میرزایان ہند و فصیحان رند محاورہ آرند منظور دارد زبانِ ہندی بھاکا را موقوف کردہ، محض روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند باشد اختیار نمودہ شد[3]۔"

اشراف پسندی اور درباری زدگی کا یہی رویہ سید انشا اور شیخ ناسخ تک برقرار رہتا ہے۔ سید انشا اپنی مشہور کتاب "دریائے لطافت" میں فصیح الفاظ اور غیر فصیح الفاظ، فصیح محاورہ اور غیر فصیح محاورہ کی تشریح و تفصیل بیان کرتے وقت ایک ہی سانس میں دہلی کی زبان کو مستند اور فصیح بھی قرار دیتے ہیں اور دہلی کے محلہ مغلپورہ میں رہنے والوں کی اردو کو صرف اس وجہ سے غیر فصیح بھی بتاتے ہیں کہ یہ لوگ "باتیں" کی بجائے "باتاں" اور "تلواریں" کی بجائے "تلواراں" بولتے ہیں۔ سید انشا نے

"دریائے لطافت" ۱۸۰۳ء میں لکھی۔ اس زمانے کی دلی میں روزمرہ بول چال کی اردو کا اندازہ "دریائے لطافت" کے اس اقتباس سے کیجیے: "میں نے کھا کے کروٹی کر کے کہا کہ میں ہنڑ جاتا ہوں بُن کے بچارے نے چار پیسے کیسے میں سے کڈھ کے دیئے کہ اس وا کچھ بچارے سے لے کر منھ وِچ ڈال دے جانا ہے"

انیسویں صدی کے اوائل میں دہلی کی اس زندہ اردو پر سید انشا کو سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ "این زبان اکثر جاہلان و عوام شہراست" ناسخ کو ڈاکٹر شوکت سبزواری نے "زبان کی شریعت کے مجدد" کے لقب سے نوازا ہے مگر ان کی لسانی تجدید کے محرکات کا حال صغیر بلگرامی کی کتاب "جلوہ خضر" میں دیئے گئے متروکات پر ایک نظر ڈالنے سے کھلتا ہے۔ ناسخ "مہندی کے رنگ" کی بجائے "رنگ حنا" اور سجن کی بجائے "صنم" استعمال کرنے کا لسانی فرمان جاری کرتے ہیں۔ گویا اصلاح زبان کی سرگرمی کا رُخ بول چال کی زبان اور ادبی زبان کے درمیان حائل اس خلیج کو از سر نو پیدا کرنے کی طرف تھا جسے اٹھارویں صدی میں ریختہ گوئی کے رواج نے پاٹ دیا تھا۔

یہ بات معنی خیز ہے کہ حاتم نے جس لفظ کو جس "دغا شک" اور "رطب و یابس" سمجھا، سید انشا اور شیخ ناسخ جیسے غیر فصیح بتا کر ترک کر دینے پر کمربستہ ہوتے ہمارے ظفر اقبال نے اس گوہر نایاب کو شاعرانہ معانی سے لبریز پایا اور پھر سے اس اہتمام کے ساتھ رائج کرنے کی ٹھانی ہے کہ اپنے ایک شعری مجموعہ کا نام ہی "رطب و یابس" چنا ہے۔ زمانے کا الٹ پھیر دیکھیے کہ حاتم کے عہد میں جس لفظ کو عامیانہ گردانتے تھے وہ اب عوامی کہلاتا ہے؟ رعزدوقار کی سند پاتا ہے۔ آج تو خیر عامیانہ، عوامی ہو گیا مگر حاتم، مظہر جانجاناں اور خان آرزو کے لسانی استبداد کے سائے تلے پنپنے والے میر تقی میر نے عامیانہ الفاظ و محاورات کو ایک شانِ اجتہاد کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اس ادبی اور تہذیبی انقلاب اور اس کے تاریخی اور تہذیبی اسباب سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسین کہتے ہیں۔

"جن طبقوں نے اردو کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا وہ عوام سے خاصے قریب تھے۔ اردو شاعری کا رواج عام تصور کے برخلاف دربار شاہی کی سرپرستی اور امرا کی قدردانی کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ یہ ان نئے طبقوں کی آواز تھی جن کی تہذیبی عنان اب محض دربار کے ہاتھ میں نہ تھی بلکہ انہوں نے دلّی کی سماج میں خود اپنا رنگ جما لیا تھا اور دربار کے باہر بھی ایک مخصوص منفرد، تہذیبی فضا پیدا ہو گئی تھی یہ فضا دربار کی دست نگر نہ تھی اور اس فضا کی تشکیل تزئین و ترتیب میں اس دور کے شہری عوام کا ہاتھ تھا۔ اردو ادب ان طبقوں کی دین ہے جو دربار سے الگ اپنا ایک تہذیبی وجود اور ذریعہ اظہار تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دربار نے اس نئے تہذیبی آہنگ و اسلوب کو صرف اس وقت تسلیم کیا جب وہ پوری سماج پر اپنا تسلط جما چکا تھا۔ ریختہ نے پہلی بار شہری عوام کے جذبہ اظہار کو زبان دی، ادبی زبان اور بول چال کی زبان کے فرق کو مٹایا اور جو کام دیہات میں بولیاں کر رہی تھیں اسے شہر کے پیمانے پر تہذیبی ہمہ گیری اور لطافت کے ساتھ ریختہ نے پورا کر دیا"[1]

شمالی ہند میں فارسی کی بجائے اردو اور مشاعروں کی بجائے مراختوں کی مقبولیت کے پیچھے درباری اور عوامی تہذیبی

[1] (دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی پس منظر صفحات ۲۹، ۳۰)

کشمکش فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوئی اور عہد کے تخلیق فن کار نے لسانی اور ادبی خود مختاری کا علم بلند کیا۔

شعر میرے ہیں گو کہ خاص پسند

گفتگو پر مجھے عوام سے ہے

اس لسانی اور ادبی انقلاب کو رد کرنے کی خاطر خان آرزو کے سے بزرگوں نے عوامی اردو کو اردوئے معلی بنانے کی ٹھانی۔ وہ اردو تو طرز پیرزح اور عامیانہ ٹھہری جس میں صوفیانہ تجربات سے برآمد ہونے والی سچائیوں کا اظہار ہو رہا تھا جس میں شاہ عبدالقادر نے قرآن حکیم کا ترجمہ کیا تھا، اور جس میں میر و سودا اپنے عہد کا شہر آشوب لکھنے میں مصروف تھے اور طبقہ امرا کے مزاج معلی کے مطابق اردو کی تراش خراش کا دو صدیوں پہ پھیلتے چلے جانے والا عمل شروع ہوا۔ بے شک اس عمل نے اردو کو عجمی تمدن کی رعنائی اور لطافت بخشی مگر ساتھ ہی ساتھ اس کے عوامی حسن و جمال کو لوٹا بھی اس عمل کے زیر اثر جہاں اردو نے فارسی اور عربی ادبیات کے محاسن کو اپنے دامن میں سمیٹا وہاں رفتہ رفتہ بول چال کی زبان اور ادبی زبان میں پھر سے ایک خلیج بھی پیدا ہو گئی اور یوں اردو اپنے وطن میں ہی اجنبی سی نظر آنے لگی۔ فطرت کے انداز بھی نرالے ہیں۔ اردو ادب کے اشراف نے جس لفظ کو متروکات سخن میں شمار کیا وہ آج بھی ہماری علاقائی زبانوں میں زندہ و منور ہے اور گھوم پھر کر ایک ہی بات نہ کہنے والوں کے لئے عجب کشش رکھتا ہے۔ چنانچہ عوام کی زبان کے جذباتی آہنگ کی بازیافت کے لئے آج کے لکھنے والے پاکستانی زبانوں سے الفاظ ہی نہیں اسالیب بھی اپنا رہے ہیں یہ اسالیب و الفاظ، علاقائی زبانوں میں تو عہد قدیم سے موجود و مروج ہیں مگر اردو ادب کے لئے حرف تازہ اور اسلوب تازہ کی شان رکھتے ہیں۔

تلاش و تجسس کی یہ لہر اپنے دامن میں لفظ و اسلوب ہی نہیں فکر و احساس کے نئے خزانے بھی سمیٹتی چلی آ رہی ہے۔ بات یہ ہے کہ سی حرفی کافی اور وائی صرف تکنیک اور محض ہیئت سے کہیں زیادہ ایک منفرد نظام فکر و احساس کے نام ہیں۔ انہیں اپنانے کے لئے اس تصور کائنات سے بھی رشتہ جوڑنا پڑتا ہے جس سے یہ اصناف پھوٹی ہیں۔ اظہار کے یہ فنی سانچے حقیقت کے اس تصور کی دین ہیں جس کا دائرہ عالم طبعی تک محدود نہ تھا بلکہ مابعد الطبیعات تک پھیلا ہوا تھا، اور جس کی رو سے:

جسمِ خاکی کے تلے جسمِ مثالی بھی ہے۔

اک قبا اور بھی ہم زیر قبا رکھتے ہیں

یہ اصناف ادب ایک ایسے معاشرے کی جذباتی اور تہذیبی ضرورتوں کو پورا کرتی تھیں جس میں جسمِ خاکی اور جسمِ مثالی حقیقت اور ماورائے حقیقت، فطرت اور مافوق الفطرت کی سرحدیں الگ الگ نہیں ایک دوسرے میں پیوست تھیں بلکہ دونوں عالم کا ایک عالم تھا۔ بے شک یہاں ظاہر کی آنکھ سے نظر آنے والے حقائق اہم تر تھے۔ پھر تقلید مغرب کی رو میں ہم نے صرف ظاہر کی آنکھ سے تماشا کرنے کی خواہش اپنائی رفتہ رفتہ حقیقت کے اس تصور پر ایمان لائے جس کا دائرہ فقط مادی دنیا تک محدود ہے۔ ہمارے جدت پسند ذہن کی علاقائی ادبیات کے قدیم چلن کی جانب یہ پیش قدمی اس حکمت و تخیل کی بازیافت کا عمل ہے جسے ہیر دی مغرب کی دھن میں ہم گنوا بیٹھے ہیں۔ اس اعتبار سے حرف تازہ اور اسلوب نو بہ نو کی یہ جستجو اس صوفیانہ طرز احساس ہی کا ایک کرشمہ

ہے جس کا پہلا بھرپور اظہار انتظار حسین کے مجموعۂ "آخری آدمی" کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ اور پھر انتظار حسین ہی کے زیر اثر خالدہ حسین سے لے کر مظہر اسلام تک جدید فکشن میں پھیلتا چلا آرہا ہے۔ یہ اتفاق کتنا عجیب ہے کہ اب سے ایک صدی پہلے ہم جدیدیت کی تلاش میں اپنی ذات سے باہر نکلے تھے۔ مگر مختلف زمانوں اور زمینوں کی سیاحت کے بعد آج جدیدیت ہی کی دُھن میں اپنی ذات کے روبرو ہیں۔

درشہوار ابراہیم

اُردو کی ملی شاعری

ادیبوں اور شاعروں کا معاشرے سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ یہ معاشرے سے متاثر بھی ہوتے ہیں اور اسے متاثر بھی کرتے ہیں۔ اب یہ اپنی اپنی توفیق ہے کہ کون معاشرے کو کس قدر اور کس طرح متاثر کرتا ہے۔ اور خود اس سے کیا اثر قبول کرتا ہے۔ بہرحال یہ ماننا پڑے گا کہ اچھا ادب زندگی آمیز بھی ہوتا ہے اور زندگی آموز بھی۔ ادب شعر اور معاشرے کے درمیان گہرے رشتے کا ثبوت اردو شاعری سے بھی ملتا ہے۔ اردو شاعری پر بالعموم اور اردو غزل پر بالخصوص بعض افراد کی طرف سے "محض گل و بلبل کی شاعری" کا جو الزام لگایا ہے اس شاعری کے مزاج سے واقف کسی بھی منصف مزاج اہل علم کے نزدیک اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اردو شاعری کے تفصیلی جائزے سے یہ حقیقت بخوبی ثابت ہو جاتی ہے کہ ہر دور میں اس میں ہماری ملّت کی حالت، اس کی بیم ورجا کی کیفیت اس کی امیدیں اور آرزوئیں، اس کی ناکامیاں اور کامیابیاں اس کے ارادے اور منصوبے غرض کہ ہر پہلو پوری طرح منعکس ہوا ہے اردو شاعروں نے نہ صرف بیداری و آزادیٔ ملت کی تحریکوں کو اپنی شاعری سے تقویت دی اور پروان چڑھایا بلکہ ایسے شاعروں کی بھی کمی نہیں جنہوں نے ان تحریکوں میں عملی حصہ لے کر ملت کی رہنمائی کی اردو شاعری میں ہماری ملّت کے درد و غم آرزوئیں اور امنگیں کہیں صاف طور پر بیان ہوئی ہیں تو کہیں استعارے کے رنگ میں جھلکتی نظر آتی ہیں۔ ان کے براہِ راست ذکر کی بھی کمی نہیں اور ایما و اشارہ، مجاز و استعارہ اور کنایہ و علامت کے رنگ میں بھی احوال ملّت اور وقت کے تقاضوں کو بڑی خوبصورتی سے موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے یہ نظمیں اور غزلیں معنوی وسعت کی آئینہ دار ہیں۔ رہنما، ناخدا، صیاد بلبل قفس، آشیاں، سفینہ، ساحل فلک، میخانہ، محتسب، شمع و پروانہ وغیرہ کے پردے میں جو کچھ کہا گیا ہے اہل نظر پر اس کے معنی واضح ہیں اور اس کا اثر کسی بھی دوسری شاعری سے کمتر نہیں ہے۔

مسلمانوں نے عرصۂ دراز تک اقوام عالم کی رہبری کی، علم و دانش کے مختلف شعبوں پر آج بھی مسلم عالموں کی تحقیق و تخلیق کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ مسلمان حکمرانوں کی علم پروری اور وسیع النظری کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے نہ صرف مسلم ارباب دانش کو سہولتیں مہیا کیں اور ان کی ہمت افزائی کی بلکہ اہل علم غیر مسلموں کو بھی نوازا چنانچہ مسلمان حکمرانوں کے دارالحکومت ہر طرح کے اصحاب فضل و کمال کے لئے بے حد کشش رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملّت اسلامیہ نے اپنے عروج کے زمانے میں نسل انسانی کی جو خدمت کی اور تہذیب و تمدن اور علم و دانش کے مختلف شعبوں کو جس طرح ترقی دی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

جیسے چاند بدرِ کامل ہو جانے کے بعد آہستہ آہستہ ڈھلنے لگتا ہے اسی طرح رفتہ رفتہ یہ دورِ عروج و کمال بھی ختم ہوا اس میں اپنی کوتاہیوں کا بھی دخل تھا اور غیروں کی چیرہ دستیوں کا بھی نتیجہ آخر یہ نکلا کہ کامرانی کی جگہ ناکامی حصے میں آئی، حاکم محکوم بن گئے عزت

و دولت کی جگہ نکبت دادبار نے لے لی اور ترقی کی بجائے تنزل کا دور دورہ ہوا۔

برصغیر جنوبی ایشیا میں اردو شاعری نے عمومی طور پر سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں ترقی کی۔ اردو شاعری کے اس ابتدائی دور میں ملک کے حالات سیاسی اور اقتصادی طور پر نہایت ناسازگار تھے۔ سلطنت مغلیہ کی قائم کی ہوئی مرکزیت ختم ہو رہی تھی اور افراتفری، جنگ و جدال، لوٹ مار اور عدم استحکام کی وجہ سے ملک کی اقتصادی حالت خراب تر اور مسائل شدید تر ہوتے جا رہے تھے، اطمینان و سکون رخصت ہو رہا تھا اور فکر فردا بڑھ رہی تھی۔ اس زمانے کے اردو شعراء نے ان حوصلہ شکن حالات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ شاعری میں اس زمانے کی زبوں حالی اور آلامِ روزگار کا ذکر اپنی ذات کے حوالے سے بھی ہوا ہے اور اجتماعی سطح پر بھی لیکن جہاں ذاتی غم والم کا بیان ہے وہ بھی بنیادی طور پر معاشرے کی خرابی اور ملت کی زبوں حالی کا آئینہ دار ہے۔ مزید یہ کہ حالات کی خرابی کا براہ راست بھی ذکر کیا گیا ہے اور گل و بلبل کے پردے میں بھی لیکن غزل کے مزاج سے آشنا افراد کو شاعروں کے حقیقی مطالب کو سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

اردو شاعری کے اس اولین دور میں زیادہ تر اس زمانے کے حالات کی عکاسی کی گئی ہے اس میں عام طور سے "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کا جواب نہیں ملتا۔ عموماً ملت کی زبوں حالی، حوادث زمانہ، گردش فلک، اغیار کی ستم رانیوں، اپنوں کی کج ادائیوں وغیرہ کو نظم کیا گیا ہے۔ گویا اس زمانے میں ذاتی و ملی کس مپرسی پر آہ و فغاں، رنج والم اور پریشانی کا بیان پایا جاتا ہے اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

کیا یہ بیان کیجیئے نیرنگی اوضاع جہاں — کہ بہ یک چشم زدن ہو گیا عالم ویراں
جن کے ہاتھی تھے سواری کو سو اب ننگے پاؤں — پھرے ہیں جوتے کو محتاج پڑے سرگرداں

شاہ ظہور الدین حاتم

کیوں کر کٹیں گے یارب بے شمار فاقے — مجھ کو تو دوسرا ہے نفروں کے چار فاقے
اعلیٰ سے تا بہ ادنیٰ جتنے ہیں گرسنہ ہیں — لشکر میں ہو گئے ہیں بے اعتبار فاقے

میر اشرف علی فغاں

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی — کوٹھے کی چھت نہیں ہے یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی — ہر گھر میں اس طرح سے در آئی ہے مفلسی۔

نظیر اکبر آبادی

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو — جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا — غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں (انشا)

کہیئے نہ انہیں امیر اب اور نہ وزیر — انگریزوں کے ہاتھ یہ قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منہ سے بولیں — بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر (جرأت)

ہندوستان کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی — وہ بھی فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی (مصحفی)

چوڑا چکے سکھ، مرہٹے، شاہ و گدا زرخواہاں ہیں — چین سے ہیں جو کچھ نہیں رکھتے فقر بھی اک دولت ہے یہاں (میر)

یاروں کے وجود کا بیان کیا ہے — وہم میں ان کے بھی جہاں کیا ہے۔

آشکارہ ہے سب نہاں کیا ہے — دیکھتے ہیں کہیں کہ یاں کیا ہے۔

الیسی صحبت میں ہم نہ ہوتے کاش (میر)

کہا یہ آج میں سودا سے کیوں تو ڈانواں ڈول — پھرے ہے جا کہیں نوکر ہو لے کے گھوڑا مول

لگا وہ کہنے یہ اس کے جواب میں دو بول — کہ میں کہوں گا تو سمجھے گا تو کہ یہ ہے ٹھٹھول

بتا کہ نوکری ملتی ہے ڈھیریوں یا تول۔

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند — سو آمد اُن کی تو جاگیر سے ہوتی ہے بند

کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند — جو ایک شخص تھا بائیس صوبوں کا خاوند

رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول

جیسے کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اس دور کی ملی شاعری کا عمومی رنگ افسردگی و اضمحلال اور آہ و فغاں کا تھا، عام طور سے اس میں جد و جہد، فکر و تدبیر وغیرہ کا ذکر نہیں ملتا لیکن یہ دور دعوت سعی و عمل دینے والی شاعری سے یکسر خالی بھی نہیں۔ مومن خان مومن نے "ولولہ جہاد" کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی تھی جس میں مسلمانوں کو سید احمد بریلوی کی تحریک میں شمولیت اور جہاد کی ترغیب دی گئی تھی اس مثنوی کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

پلا ساقی مجھ کو شراب طہور — کہ اعفا شکن ہے خمار فجور

کوئی جرعہ دے دیں فزا جام کا — کہ آجائے بس نشہ اسلام کا

یہی تو کچھ اب آگیا ہے خیال — کہ گردن کشوں کو کروں پائمال

زہے سید احمد قبول خدا — سر امتحان رسول خدا

رہے حشر تک زندہ و نیک ذات — ہے کفار کی موت اس کی حیات

ہوا مجتمع لشکر اسلام کا — اگر ہو سکے وقت ہے کام کا

ضرور ایسے مجمع میں ہونا شریک — کہ خوش تم سے ہو وحدہٗ لاشریک (مومن)

مومن ہی کی درج ذیل رباعی میں بھی سید احمد شہید کی تحریک جہاد کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

مومن تمہیں کچھ بھی ہے جو پاس ایمان — ہے معرکۂ جہاد چل دیجئے وہاں

انصاف کرو خدا سے رکھتے ہو عزیز — وہ جاں جسے کرتے تھے بتوں پر قرباں (مومن)

اسی طرح جنگ آزادی کے ایک سپاہی مولوی لیاقت اللہ نے بھی اپنے اشعار کے ذریعہ جہاد کی تلقین کی تھی ان کے چند اشعار درج ذیل ہیں

واسطے دین کے لڑنا نہ پئے طمع بلاد | اہل اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد
فرض ہے تم پہ مسلمانو جہادِ کفار | اس کا ساماں کرو جلد اگر ہو دیں دار
دین اسلام بہت سست ہوا جاتا ہے | غلبۂ کفر سے اسلام مٹا جاتا ہے
بارہ سو سال کے بعد آئی یہ دولت آ گے | حیف اس دولت بیدار سے مومن بھاگے
دوستو جب تمہیں مرنا ہی مقدر ٹھہرا | پھر تو بہتر ہے کہ جاں دیجیئے در راہ خدا
سینکڑوں جنگ میں جاتے ہیں تو پھر آتے ہیں | سینکڑوں گھر میں بھی رہتے ہیں تو مر جاتے ہیں

جدوجہد اور سعی و عمل کی خواہش کچھ مومن اور مولوی لیاقت اللہ تک ہی محدود نہیں تھی، بہادر شاہ ظفر کا کلام یاس و پژمردگی رنج و افسوس اور آہ و فغاں سے بھرا ہوا ہے لیکن انہیں بھی علم تھا کہ محض آہ و فغاں سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

قفس میں ہے کیا فائدہ شور و غل سے | اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں | (ظفرؔ)

چنانچہ ان کی بھی خواہش تھی کہ

کشتۂ قامت اس کے ہیں جتنے آپس میں سب مل جل کر
کردیں اک گھر اک حشر بپا کیا اچھا ہو کیا اچھا ہو (ظفرؔ)

آخر کار بہادر شاہ ظفر کی یہ خواہش کسی حد تک ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی شکل میں پوری ہوئی لیکن منظم و مربوط تحریک کی کمی، وحدت فکر و عمل کے فقدان، وسائل کی قلت اور مسائل کی کثرت کی وجہ سے بیرونی غلبے سے نجات پانے کی یہ آخری کوشش بھی ناکام رہی اور برصغیر جنوبی ایشیا پوری طرح انگریزوں کے زیر تسلط آ گیا۔ برصغیر میں مسلمانوں کی حالت عرصے سے مجموعی طور پر چنداں قابل رشک نہ تھی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ایک طرف تو مسلمانوں کی حکمرانی کے بارے میں جو تھوڑی بہت خوش فہمی باقی تھی وہ ختم ہونے سے عوام کو ایک زبردست نفسیاتی دھچکا لگا اور دوسری طرف انہیں انگریزوں کے غیض و غضب اور تیغ انتقام کا سامنا کرنا پڑا جنگ آزادی میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں ہی نے حصہ لیا تھا لیکن اس کی ناکامی کے بعد برصغیر کے باشندوں کو جو نتائج بھگتنا پڑے ان کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ سب کچھ محض مسلمانوں کا کیا دھرا تھا۔ ہندوؤں نے یا تو اس میں حصہ نہیں لیا یا اگر حصہ لیا بھی تو بہ امر مجبوری، ہندوؤں کی یہ کوشش رہی کہ سارے الزامات مسلمانوں کے سر تھوپ دیں، اس کے دو فائدے ہوتے ایک تو انگریزوں کی انتقامی کارروائیوں کا رخ مسلمانوں کی طرف موڑ دیا گیا اور دوسرے یہ کہ نو آبادیاتی حکومت سے مختلف شعبوں میں جو فوائد حاصل ہوئے وہ تقریباً کلیتہً ہندوؤں کے ہاتھ آئے۔ دوسری طرف مسلمانوں پر خصوصاً قیامت ٹوٹ پڑی اور انگریزوں نے ان پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ خواص اور عوام دونوں کو طرح طرح

کے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کا قتل عام ہوا گھر بار لوٹ لئے گئے جائیدادیں چھین لی گیئں، تجارت برباد ہو گئی اور سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے گئے۔

انگریز فوجیوں نے تو جو کچھ ظلم و ستم کیا سو کیا رہی سہی کسر خود ہندوؤں نے لوٹ مار اور قتل و غارت کے ذریعہ پوری کر دی کیونکہ انگریزوں کو مسلمانوں سے تاریخی مذہبی اور سیاسی دشمنی تھی تو ہندوؤں کو بھی ہر طرح کی عداوتیں تھیں نتیجہ یہ ہوا کہ کل تک جس قوم کے ساتھ مل کر انگریزوں کو برصغیر سے نکالنے کی کوششیں ہو رہی تھیں موقع ملتے ہی اسی نے انگریزوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا ہر طرح کا استحصال شروع کر دیا انگریزوں کو ان کے خلاف بھڑکایا اور خود فائدے حاصل کئے گویا وہی ہوا کہ

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔

دوسری طرف انگریزوں کے ظلم و ستم کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں سے نفرت شدید تر ہو گئی۔ وہ پہلے ہی انگریزوں کی نوکری اور انگریزی تعلیم کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اور ۱۸۵۷ء کے بعد تو ان دونوں سے اور زیادہ بیزار ہو گئے چنانچہ اگر کہیں سرکاری ملازمتیں ملنے کا امکان تھا بھی تو اس سے فائدہ اٹھانا دشوار تھا۔ غور کرنے کی بات ہے کہ برصغیر کی ایک اقلیت جس کا نہ اقتصادی میدان میں کوئی مقام تھا نہ سیاسی اثر و رسوخ باقی رہا تھا۔ جو تعلیمی طور پر پسماندہ اور نفسیاتی طور پر شکست خوردہ تھی۔ ابنائے وطن جس کے مخالف اور حکومت جسے سزا دینے پر تلی ہوئی تھی اگر اس نے نہ صرف اپنے ملی تشخص کو برقرار رکھا بلکہ بہت جلد اپنی حیثیت کو منوالیا تو یہ ایک حیرت انگیز کارنامہ تھا ورنہ اسپین میں مسلمانوں کے ساتھ جو گذری وہی صورت حال پیش آ سکتی تھی اور خود برصغیر میں کروڑ ہا شودروں کی موجودگی اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ یہاں شکست خوردہ قوموں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا رہا ہے اس میں شک نہیں کہ، نہایت حوصلہ شکن اور ناگفتہ بہ حالات کے باوجود ملت اسلامیہ نے جو کچھ حاصل کیا تھا اس میں رہنماؤں کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی کا بڑا ہاتھ تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جو قیامت خیز دور شروع ہوا اس کے مصائب و آلام نے اردو کی ملی شاعری پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ اس دور کے شاعروں میں سے کچھ نے تو محض اُن دردناک حالات و واقعات کی عکاسی کی لیکن دوسروں نے اس سے آگے بڑھ کر تسلی دی، ہمت بڑھائی، امید کی کرن دکھائی اور عمل کی ترغیب دی ہے اس دور سے متعلق شاعری کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ سب تخلیقات سے اقتباسات شامل کرنا ممکن نہیں اس لئے درج ذیل اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے

ہوئے دفن جو کہ ہیں بے کفن انہیں رونا ابر بہار ہے
کہ فرشتے پڑھتے ہیں مرثیہ نہ نشان ہے نہ مزار ہے
ہوئی تنگ امت مصطفیٰ نہیں اٹھتا صدمہ عذاب ہے
کہیں رحم جلد ہوا ے خدا برے وقت کا تو ہی یار ہے

(بینؔ)

دہلی کے مشہور شاعر حکیم آغا جان عیش نے دہلی کا نہایت پر درد مرثیہ لکھا جس کا مطلع تھا.

نہیں حالِ دہلی سنانے کے قابل — یہ قصہ ہے آنسو بہانے کے قابل

آخری مغلیہ تاجدار بہادر شاہ ظفر کے کلام میں تو جگہ جگہ صاف صاف بھی اور استعاروں کے رنگ میں بھی اس حادثۂ فاجعہ، سے متعلق اشعار ملتے ہیں مثلاً۔

نہ گھر ہی رہا اُن کے آنے کے قابل — نہ ہم ہی رہے واں کے جانے کے قابل

نہ گھر ہے نہ در ہے رہا اک ظفر ہے — فقط اشکِ حسرت بہانے کے قابل

جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھریاں تھے — شغال اب ہیں جہاں بستے کبھی رہتے بشریاں تھے

جہاں چٹیل ہے میداں اور سراسر ایک خارستاں — کبھی یاں قصر و ایواں تھے چمن تھے اور شجریاں تھے

اس بارے میں دوسرے شاعروں نے جو کچھ کہا ہے اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے — سر ہے اور جوشِ جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے

ٹکڑے ہوتا ہے جگر ہی پہ بن جاتی ہے — مصطفٰے خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ صحرائی ہو — قتل اس طرح سے بے جرم جو صحرائی ہو

(مفتی صدر الدین آزردہ)

بسکہ فعال ما یرید ہے آج — ہر صلح شور انگلستان کا

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک — تشنۂ خون ہے مسلماں کا (غالب)

دل تو پژمردہ ہیں داغِ غمِ گلستاں ہوں تو کیا — آنکھیں روتی ہیں دہانِ زخم خنداں ہوں تو کیا

مسجدیں ٹوٹی پڑی ہیں صومعے ویراں ہیں — یادِ حق میں ایک دو دل ہائے سوزاں ہوں تو کیا

کربلا میں یا نجف میں چل کے مرجائیں منیر — ہند میں ہم پہلوئے گورِ غریباں ہوں تو کیا

کچھ شواہد قید کے لکھوں اگر — خون ٹپکے ہر لبِ تقریر سے

"باندہ" کے زندان میں لاکھوں ستم — سہتے تھے ہم گردشِ تقدیر سے

(منیر شکوہ آبادی)

عجیب مجمع اہلِ کمال تھا افسوس — ہزار حیف وہ صحبت فلک نہ دیکھ سکا.

نہ پانچوں وقت کی نوبت نہ وہ دیاں نہ گجر — نہ توپ چلتی ہے اب غضب کا سناٹا

یہ حکم ہے کہ نہ ہوں چار ایک جا باہم — وہ دن گئے کہ شب و روز رہتا تھا جلسا

میر امان علی سحر

تختہائے ارغوان و لالہ و گل کیا ہوئے — کشور آبادِ سلطانِ چمن کیا ہو گیا
کون سے ناواقفوں نے کاٹ ڈالا سرو کو — مصرعِ موزونِ دیوانِ چمن کیا ہو گیا
اپنے موقع پر نظر آتا نہیں کوئی نہال — انتظامِ نخلبندانِ چمن کیا ہو گیا

میر وحید الدین وحید الہ آبادی

کیوں کر دلِ غمزدہ نہ فریاد کرے — جب ملک کو غنیم یوں برباد کرے
مانگو یہ دعا اب کہ خداوندِ کریم — اجڑی ہوئی سلطنت کو آباد کرے

میر ببر علی انیس

کھلی ہے کنجِ قفس میں مری زبان صیاد — میں ماجرائے چمن کیا کروں بیان صیاد
نکالیو نہ قدم آشیاں سے او بلبل — لگائے بیٹھے ہیں پھندے جہاں تہاں صیاد
چمن میں رکھا نہ بلبل کا نام تک باقی — خدا کرے یوں ہی ہو جائے بے نشاں صیاد
مرے بیان کو سن سن کے کانپ کانپ اٹھا — غضب یہ ہے کہ سمجھتا نہیں زبان صیاد

(میر یار علی رند)

نہیں جہان میں واللہ اس جفا کی پناہ — جو انتقام ہو اس کا تو بس خدا کی پناہ

یہ وہ الم ہے کہ اس غم سے سب ہلاک ہوئے — لگا کے چرخ سے سجین تا سماک ہوئے
ہلاک گور میں آسودگانِ خاک ہوئے — کفن بھی ساتھ گریبان کے چاک چاک ہوئے
نہ روزِ حشر سے کم تھی عذاب کی صورت
خدا دکھائے نہ اس انقلاب کی صورت

گلی گلی سے ہے آتی صدائے واویلا — زمیں زمیں سے ہے اٹھتی نوائے وادردا
دکان دکان سے، گھر گھر سے حشر ہے پیدا — مکاں مکاں سے اٹھا غلغلہ ہے شیون کا
چہار سمت رواجِ ستم پرستی ہے
فلک سے تازہ بلا پڑپڑا برستی ہے

ہر ایک رونقِ بزمِ جہان قتل ہوا — ہر ایک قبلۂ ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک طوطیِ شیریں زبان قتل ہوا — ہر ایک بلبلِ نوشیں بیان قتل ہوا

گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ پشتے ڈالے ہیں

نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں — سید ظہیر الدین ظہیر

فلک نے قہر و غضب تاک تاک کر ڈالا — تمام پردہ ناموس چاک کر ڈالا

یکایک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا — غرض کہ لاکھوں کا گھر اس نے خاک کر ڈالا

جلے ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں

کھنچی ہیں کانٹوں پہ جو پتّیاں گلاب کی تھیں۔

زبانِ تیغ سے پرسش ہے داد خواہوں کی — رسن ہے طوق ہے گردن ہے بیگناہوں کی

زمیں کے حال پہ اب آسمان روتا ہے — ہر اک فراق مکیں میں مکان روتا ہے

کہ طفل و عورت و پیر و جوان روتا ہے

غرض یہاں کے لئے اک جہان روتا ہے

جو نوکری ہے تو اب یہ ہے نوجوانوں کی — کہ حکم عام ہے بھرتی ہے قید خانوں کی

نواب مرزا خاں داغ دہلوی

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد کچھ عرصے تک مسلمانوں میں انگریزوں سے نفرت اور ترک موالات اور اپنی افسوسناک حالت پر اظہار غم وغصہ کا رجحان غالب رہا۔ وہ نہ انگریزی زبان سیکھنا چاہتے تھے نہ انگریزوں کی ملازمت کے خواہشمند تھے اور نہ اُن سے مجلسی تعلقات قائم کرنے کے روادار تھے۔ دوسری طرف انگریز خود اُن سے بیزار تھے اور ہر طرح کی انتقامی کاروائیوں پر آمادہ ہی نہیں بلکہ عامل، انہیں غیر مسلموں کی بہت بڑی اکثریت کی تائید وحمایت حاصل تھی جس کو آبادی، مال ودولت، اثر ورسوخ مختصر یہ کہ ہر حیثیت سے مسلمانوں پر فوقیت حاصل تھی انگریزوں نے اپنی انتظامیہ اور فوج کی مدد اور غیر مسلموں کے تعاون سے، حکومت کو اس قدر مستحکم کر لیا تھا کہ انہیں مسلمانوں کی تائید وحمایت حاصل کرنے کی چنداں پرواہ نہ کی۔

مسلمانوں کے معاملہ فہم اور دوراندیش رہنماؤں نے اس حقیقت کو محسوس کر لیا کہ یہ صورت حال انگریزی حکومت کے مقابلے میں مسلمانوں کے لئے زیادہ پریشان کن اور نقصان دہ ہے اور اگر حالات یوں ہی رہے تو مسلمان اپنے ہی ملک میں نہایت ادنیٰ درجے کے شہریوں کی حیثیت اختیار کر لیں گے جن کے پاس نہ مال ودولت ہوگی نہ علم وفضل، نہ اعلیٰ ملازمتیں، نہ تجارت وصنعت اور نہ کسی قسم کا اختیار۔ وہ حاکموں اور ابنائے وطن سے الگ تھلگ ہو کر محض اپنی موجودہ حالت پر اظہار افسوس اور پدرم سلطان بود کا ورد کرتے رہیں گے۔ پھر RIP VAN WINKLE کی طرح جب اُن کی آنکھیں کھلیں گی تو انہیں معلوم ہوگا کہ زمانہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے اور اس وقت کفِ افسوس ملنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس لئے ضرورت اس امر کی تھی کہ اغیار کے مقابلے میں مسلمانوں کی ہر طرح سے سقیم حالت کو بہتر بنایا جائے نہ کہ اپنی غیر دانشمندانہ حرکات،

ہے ایسے اور بھی ابتر کر دیا جائے۔ ان حقائق کا پوری طرح ادراک سب سے پہلے سرسید احمد خان کو ہوا چنانچہ انہوں نے اس زمانے میں نہایت محنت ہمت اور مستقل مزاجی سے مختلف اقدامات کئے برصغیر میں مسلمانوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے دو باتیں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل تھیں اول یہ کہ انگریزوں کے دل سے مسلمانوں کے خلاف نفرت کے جذبات کو ختم کیا جائے اور دوسری طرف ان کی مناسب تعلیم کا بندوبست کیا جائے تاکہ انہیں جدید علوم سے واقفیت حاصل ہو اور ان کے لئے سرکاری ملازمتوں کا حصول بھی ممکن ہو سکے۔ پہلے مقصد کے حصول کے لئے سرسید نے ایک کتاب "اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھی اور دوسرے مقصد کی تکمیل کے لئے تعلیمی ادارے قائم کرنے کی طرف توجہ دی جن میں علی گڑھ کالج اور یونیورسٹی نے سب سے زیادہ اہم کام سرانجام دیا اور شہرت حاصل کی سرسید نے مخلص اور قابل افراد کی ایک جماعت کے ساتھ مل کر حالات کے تقاضوں کے مطابق ملتِ اسلامیہ کی بے حد خدمت کی۔

اسی دور میں رفتہ رفتہ شاعروں کو بھی اس حقیقت کا احساس ہوا کہ محض سینہ کوبی، آہ و فغاں اور گذرے زمانے کے ماتم سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اگر ملت اسلامیہ کی حالت کو بہتر بنانا ہے تو اس کے لئے فکر و تدبیر اور سعی و عمل کی ضرورت ہے چنانچہ اردو شاعری میں "شہر آشوب" کا انداز کم ہوتا گیا۔ اور نغمۂ بیداری ملت کی لے تیز ہوتی گئی اس تبدیلی کی ابتدا حالی سے ہوتی ہے جو سرسید کے قریبی ساتھی تھے۔ اُن کے کلام نے ملت اسلامیہ کو بیدار کرنے، اسے احساسِ زیاں دلانے اور سعی و عمل کی طرف راغب کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ملتِ اسلامیہ کی جدوجہد آزادی کی کوئی داستان مسدس حالی کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں کہی جا سکتی! اس میں ایک طرف مسلمانوں کے شاندار [illegible] ماضی اور حال کی خرابیوں کی بھرپور عکاسی کی گئی تو دوسری طرف جدوجہد اور حالات میں بہتری کی امید پر زور دیا گیا اس اندازِ فکر سے متعلق چند اشعار درج ذیل ہیں

لیے علم و فن اُن سے نصرانیوں نے — کیا کسبِ اخلاق روحانیوں نے
ادب اُن سے سیکھا صفاہانیوں نے — کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں نے

ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

غرض عیب کیجیے بیان اپنے کیا کیا — کہ بگڑا ہوا یاں ہے آوے کا آوا
فقیہ اور جاہل، ضعیف اور توانا — تاسف کے قابل ہے احوال سب کا

مریض ایسے مایوس دنیا میں کم ہیں
بگڑ کر کبھی جو نہ سنبھلیں وہ ہم ہیں

حوادث نے ان کو ڈرایا ہے کچھ کچھ — مصائب نے نیچا دکھایا ہے کچھ کچھ
ضرورت نے رستہ دکھایا ہے کچھ کچھ — زمانے کے غل نے جگایا ہے کچھ کچھ

ذرا دست و بازو ہلانے لگے ہیں
وہ سوتے میں کچھ کلبلانے لگے ہیں

بشر کو ہے لازم کہ ہمت نہ ہارے — جہاں تک ہو خود کام اپنے سنوارے
خدا کے سوا چھوڑ دے سب سہارے — کہ ہیں عارضی زور کمزور سارے
اڑے وقت تم دائیں بائیں نہ جھانکو
سدا اپنی گاڑی کو خود آپ ہانکو

اس سلسلے میں چند دیگر شعرا کے کلام سے اقتباسات ملاحظہ ہوں

ہے سامنے کھلا ہوا میدان چلے چلو — باغِ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو — ہمت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو
(مولوی محمد حسین آزاد)

ہر چند کہ دعویٰ تھا تمہیں سیف و قلم کا — تھا فخر تمہیں نسل عرب اور عجم کا
لیکن نہ رہا طرز وہ عادات و شیم کا — سیکھا نہ دو تیرہ کوئی ارباب ہمم کا
ناچار ہر اک قوم نے تم کو لیا دھمکا — بے سعی کسی کا بھی ستارہ نہیں چمکا
تم راہ طلب میں اگر اب بھی ہو شتابان
ہو کوکب عزت افق دہر پہ تابان
(مولوی محمد اسماعیل)

کیا لے گا خاکِ مردہ و افتادہ بن کے تو — طوفان بن کہ ہے تری فطرت میں انقلاب
کیوں ٹمٹمائے کرمکِ شب تاب کی طرح — بن سکتا ہے تو اوجِ فلک پر اگر شہاب
چڑیوں کی طرح دانے پہ گرتا ہے کس لئے — پرواز رکھ بلند کہ تو بن سکے عقاب
(مولوی وحید الدین سلیم)

ہاں ہاں سنبھالو قوم کو شاید سنبھل ہی جائے — گرگر کے ملک ہند کچھ آخر سنبھل گیا
اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی — دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(جوش شاہ دین ہمایوں)

دانہ کہتا ہے کہ مرکز سے اگر تم ہٹ گئے — مسبس ہی ڈالے گی تم کو آسیائے انقلاب
خود بھی کچھ کر کے دکھا گردش کی کٹ پتلی نہ بن — جوہر تقلیب پیدا کر بجائے انقلاب
(سید غلام بھیک نیرنگ)

شرمندۂ پستی ہے دنیا میں تری ہستی
ہنگام افق تابی اور تیری یہ خاموشی

سجدہ دشِ ہمالہ پر رفعت کا نشاں ہوجا
یا شورِ جرس بن جا یا بانگ اذاں ہوجا
(سید نجم الہدیٰ گیلانی)

اب دنیا کا وہ رنگ نہیں
اغیار کا تو پاسنگ نہیں
گو تاج نہیں اورنگ نہیں

وہ طرز صلح و جنگ نہیں
کیا تجھ کو شرم و ننگ نہیں
پر ملک خدا کا تنگ نہیں

اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

(محمد فاروق دیوانہ گورکھپوری)

کاہلی میں قوم پڑ کر علم و فن کھوتی گئی
کیوں نہیں مسلم یہاں شانہ بشانہ سب کے ساتھ
آزمائش کا زمانہ سخت تر آنے کو ہے

خوبیاں غائب ہوئیں حالت ردی ہوتی گئی
ہے صلہ دینے میں یکساں یہ زمانہ سب کے ساتھ
اہلیت جس میں نہیں وہ قوم مٹ جانے کو ہے

(حافظ محمد ولایت اللہ)

بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے کچھ بعد تک اردو کے مسلمان شعرا کا انداز عام طور سے "معتدل" رہا۔ حسرت کا کردار اور انداز فکر کئی اعتبار سے اس دور میں منفرد حیثیت کا حامل ہے آزادی کی تڑپ محض ان کی شاعری میں ہی نظر نہیں آتی، بلکہ اُن کی کل زندگی جد و جہد آزادی کی بھرپور داستاں ہے انہیں پہلی مرتبہ ۶ر اگست ۱۹۰۸ء کو قید سخت کی سزا ملی اور پھر تو جیل جانا گویا اُن کا معمول ہوگیا اُن کا مشہور شعر

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

شاعرانہ مبالغہ نہیں بلکہ ایک تلخ حقیقت کا شاعرانہ بیان ہے اُن کا طرز عمل یہ تھا کہ

تحریک حریت کو جو پایا قرینِ حق
ہر عہد میں معاونِ تحریک ہم رہے

ان کا اصول اور عمل یہ رہا کہ

حق سے بہ عذرِ مصلحتِ وقت پہ جو کرے گریز
اس کو نہ پیشوا سمجھ اس پہ نہ اعتبار کر

اس زمانے میں حسرت کا انداز فکر و عمل غیر معمولی نوعیت کا تھا لیکن حالات کے تقاضوں نے رفتہ رفتہ عام طور سے شعرا کو "معتدل انداز" ترک کرنے پر مجبور کر دیا اس صورت حال کے پیدا کر دینے میں تقسیم بنگال کی منسوخی، جنگ طرابلس، جنگ بلقان، سانحہ مسجد کانپور اور جنگ عظیم اول میں ترکیہ کی شکست وغیرہ متعدد عوامل کا حصہ تھا۔ نتیجہ کے طور پر "معتدل انداز" کی جگہ اعتماد و یقین جوش و جذبے اور دوٹوک انداز بیان کو قبول عام ہوا۔ اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

اے مدعیانِ حبِ اسلام
حجروں میں تو اب کرو نہ آرام
دعوے ہیں تو کچھ ہنر دکھاؤ
ہمت کے قدم ذرا بڑھاؤ
دیکھو وہ جستجو یہی ہے
میداں یہی ہے گو یہی ہے
موقع ہے یہی ہنر دکھاؤ
جو کہتے تھے آج کر دکھاؤ

مولانا شبلی نعمانی

زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو ہلا دیں گے
مشرق کا سر اٹھا کر مغرب سے ملا دیں گے
ہم کون ہیں ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں لیکن
وقت آنے دو وقت آنے پہ ہم تم کو بتا دیں گے
اس دین کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے
گونجیں گی پہاڑوں میں تکبیر کی آوازیں
یہ صور جہاں پھونکا مردوں کو جلا دیں گے

سید علی نقی صفی

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی
حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانے
اب بھی احساس ہو اس کا تو ابھرنا ہے یہی
نقدِ جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر
کام کرنے کا یہی ہے تمہیں کرنا ہے یہی

مولانا محمد علی جوہر

شریعت کے نگہبان پا بجولاں ہوتے جاتے ہیں
مسلمانوں کی آزادی کے ساماں ہوتے جاتے ہیں
شہیدانِ وطن کے خون کے عناب گوں چھینٹے
ہماری داستاں کا زیبِ عنواں ہوتے جاتے ہیں
ہوا ہی چاہتا ہے پاک استبداد کا قصہ
کہ چاک اپنے گریباں تا بہ داماں ہوتے جاتے ہیں
پڑی ہے کھلبلی مغرب میں یہ برقی خبر سن کر
کہ مشرق کے مسلماں پھر مسلماں ہوتے جاتے ہیں

مولانا ظفر علی خان

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
کیا ان کو خبر تھی زیر و زبر رکھتے تھے جو روحِ ملت کو
ابلیں گے زمیں سے مارِ سیہ برسیں گی فلک سے شمشیریں

شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی

عوام الناس میں ہنگامۂ احساس پیدا کر — دلوں کو از سرِ نو حسنِ حرّیت پہ شیدا کر

بتادے اہلِ باطل کو کہ حق کا نام زندہ ہے — وہی ایمان قائم ہے وہی اسلام زندہ ہے

وہی اسلام جس نے پادشاہی دی غلاموں کو — وہ اب بھی زندہ کر سکتا ہے اپنے کارناموں کو

حفیظؔ جالندھری

کلام کی وسعت اور عوام پر اثر کے اعتبار سے اس دور کے دو شاعر سرِ فہرست تھے یعنی اکبرؔ الہ آبادی اور ڈاکٹر محمد اقبالؔ۔ ان دونوں نے اپنے اپنے انداز میں ملت کی جو خدمت کی وہ اظہر من الشمس ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد برصغیر میں ایک گروہ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے طرزِ معاشرت کو اختیار کرنا چاہیئے تاکہ ہم ان میں گھل مل سکیں اور ان کا احساسِ غیریت دور ہو، اسی طرح مسلمانوں کی ترقی ممکن ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے گروہ کی رائے تھی کہ ہمیں انگریزوں کی زبان، ملازمتوں، علم وفن، تہذیب و تمدن، غرض کسی چیز سے کوئی غرض نہیں رکھنا چاہیئے اسی طرح ہم اپنے ملی تشخص کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اکبرؔ ان دونوں انتہا پسندانہ رویوں کے مخالف تھے۔ وہ انگریزوں سے علم و ہنر سیکھنے کے خلاف نہیں تھے لیکن ہر بات میں ان کی تقلید کو نہ ضروری سمجھتے تھے اور نہ اس کی افادیت کے قائل تھے۔ ان کے کلام کے اکثر حصے میں مزاح کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ اپنے زمانے کے مخصوص تقاضوں کے پیشِ نظر انہوں نے اسی طریقے کو مناسب تصور کیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا پیغام غیر واضح ہے مزید برآں ان کے کلام میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جن میں انہوں نے اپنے مافی الضمیر کو صاف صاف بیان کیا ہے ان کے اندازِ فکر کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

ہمیں لاکھ زمانہ لبھائے تو کیا — نئے رنگ جو چرخ دکھائے تو کیا

یہ محال ہے اہلِ وفا کے لئے — غمِ ملت و الفتِ دیں نہ رہے

روز افزوں ہے بلا شبہہ برٹش اقبال — جو خلاف اس کے تصور کرے وہ وہمی ہے

اپنا اقبال مگر اس نے جو سمجھا ہے اسے — یہ نئی روشنی کی صحبت غلط فہمی ہے

بن گئے صاحب ہنر صاحب کا کوئی تم میں ہے — کیا کلیں ٹپکیں گی سقفِ خانۂ خس پوش سے

جب اتنی نعمتیں ہوں جو نہیں یہاں اکبر — تو ہرج کیا ہے جو ساتھ اس کے ڈیم فول بھی ہے۔

اردو کی ملی شاعری میں اقبال کا سرمایۂ شعری سب سے زیادہ وقیع ہے انہوں نے اپنے مسلک کی بار بار وضاحت کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے داعی تھے اس لئے کہ انہیں یقین کامل تھا کہ اسلامی نظام زندگی نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام دنیا کے لئے خیر و برکت اور فلاح و بہبود کا موجب ہوگا۔ اقبال کو مسلمانوں کے روشن مستقبل کے بارے میں پختہ یقین و اعتماد تھا اس کا کچھ اندازہ ان اشعار سے کیا جا سکتا ہے

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک — بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں — محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے

یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

اقبال کو یہ علم تھا کہ یہ خوشگوار تبدیلی خود بخود نہیں پیدا ہو گی اس کے لئے ایک طرف تو مردِ مومن کی صفات پیدا کرنا ہوں گی اور دوسری طرف عملِ پیہم کا راستہ اختیار کرنا ہو گا چنانچہ فرماتے ہیں۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے۔

یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا — کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی — یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

مولانا شبلی نعمانی نے آج سے تقریباً ستر برس پہلے کہا تھا۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک — چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

اس کے کم و بیش بیس برس بعد اقبال بھی اسی نتیجے پر پہنچے چنانچہ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد میں اپنے خطبہ صدارت کے دوران برصغیر میں ایک اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ پیش کیا۔ اس مطالبے کو اس وقت تو کوئی خاص پذیرائی حاصل نہیں ہوئی لیکن آخر کار ۱۹۴۰ء میں یہی مطالبہ برصغیر کے مسلمانوں کا واحد نصب العین قرار پایا۔ اس کے تین سال بعد مسلم لیگ کے تیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی میں میاں بشیر احمد نے "پاکستان کا ترانہ" پڑھا اس کا پہلا بند تھا۔

حق ہے ہمارا پاکستان — حق پہ ہمارا ہے ایمان

آؤ کریں آج اعلان — چاہے اپنی جائے جان

لے کے رہیں گے پاکستان

لے کے رہیں گے پاکستان

اس نظم کا مصرع "لے کے رہیں گے پاکستان" برصغیر کے طول و عرض میں ایسا مشہور ہوا کہ اس نے ایک نعرۂ جنگ کی حیثیت اختیار کر لی جس میں اپنے مقصد کے حصول کا پختہ عزم پایا جاتا تھا چنانچہ وہ تحریک جو "لے کے رہیں گے پاکستان" کے پرجوش نعرے سے شروع ہوئی تھی قائدِ اعظم کی مدبرانہ رہنمائی اور مسلمانوں کی سعیِ پیہم اور اتحادِ عمل کے طفیل محض چند برسوں میں کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور پاکستان قائم ہو گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خاطر غزنوی

اُردُو نعت کا ارتقا

نعت کے لفظی معنی ہیں تعریف و توصیف، اصطلاح میں یہ لفظ ان اشعار یا کلام موزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو سرکار دو عالم، سرور کائنات، فخر موجودات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نذرانہ عقیدت کے طور پر پیش کیا جائے وہ ذات پاک جولاثانی ہے، وہ ذات گرامی جو بے داغ و مطہر ہے۔ وہ شخصیت مکرم جو منبع نور ہے، وہ حضور رحمت مآب، حسن وقار وانکسار، آسمان تقویٰ و طہارت، انتہائے امانت و دیانت، جن کی زبان حسن فراست، رفعت حق و صداقت اور شیرینی سعادت لئے ہے جن کا دل بحر حلم و محبت ہے جن کا شیوہ فیضان انصاف و عدالت ہے، جو تنویر صبر و استقامت ہیں۔ جن کی شخصیت توقیر و جاہت و شجاعت ہے، جن کی خصوصیت تقدس و طہارت جن کی گفتگو عرش فصاحت و بلاغت جن کا قد، قامت اور خد و خال معراج حسن دبی ان کی مدح و ثنا کی وسعتوں کو پا سکتا۔

نعت گوئی کی فضا بہت وسیع و لبسیط ہونے کے باوجود بعض حدود کی پابند ہے۔ شریعت نے اس کے لئے حد مقرر کر رکھی ہے۔ اگر شاعر حد سے تجاوز کرے تو یہ نیک عمل گناہ بن سکتا ہے۔ درحقیقت نعت محبوب الٰہی صلی اللہ علیہ وسلم کی شاعرانہ توصیف کو نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس کا مقصد نبوت کے کمالات کی عکاسی ہے ایسی عکاسی جس سے ذہن و روح ایک مقدس پرو اور ایک والہانہ محبت کا اثر لیں۔ جس سے روح میں بالیدگی پیدا ہو نعت ایک ایسی نازک صنف ہے کہ یہاں جرأت رندانہ اور لغزش مستانہ کو بار حاصل نہیں۔   با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

اس صنف کا اہم ترین قرینہ ادب ہے۔

جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں دنیا کی مختلف زبانوں میں جس قدر خلوص و عقیدت کا اظہار ہوا ہے اس کی مثال ممکن نہیں۔ کیوں نہ ہو اس ہستی کی تعریف و توصیف خود خدائے بزرگ و برتر نے ان الفاظ میں کی ہو۔

لولاک لما خلقت الافلاک   (اگر تو نہ ہوتا تو میں اس کائنات کو پیدا نہ کرتا)

قرآن حکیم میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت و مدحت، محاسن اور شمائل و اوصاف جگہ جگہ ملتے ہیں۔ خدائے ذوالجلال نے جن الفاظ میں آپ کا ذکر جمیل فرمایا۔ ان سے آپؐ کے رتبے کی شان عیاں ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ورفعنا لک ذکرک   (اور ہم نے آپ کے ذکر کو رفعت بخشی)

قرآن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مصطفےٰ (آل عمران) مجتبےٰ (آل عمران) احمد (صف)، محمدؐ (فتح) یٰسین (یٰسین) طٰہٰ (طٰہٰ) کملی والا (یا ایھا المزمل - مزمل) چادر والے (یا ایھا المدثر - مدثر) نبی امیؐ (اعراف) داعی الی اللہ (احزاب)،

ہادی و منذر (رعد) روشن چراغ (سراجاً منیرا احزاب) شاہد (احزاب، بشیر و نذیر (سبا) معلم کتاب و حکمت (آل عمران) نور (مائدہ) تاریکیوں سے نکالنے والا (ابراہیم) غلط بندھنوں سے نجات دلانے والا (اعراف) وغیرہ جیسے الفاظ حسنہ سے خاطب کیا گیا۔ سورہ احزاب کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نعت محبوب کے لئے جو پیرایہ اختیار کیا اس پر عقیدت نچھاور ہوتی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ط یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ہ

(تحقیق اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم بھی ان پر درود بھیجو اور خوب سلام بھیجو)

نعت نبی کے میلاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی شواہد ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت سلیمان نے غزل الغزلات کے باب پنجم آیت ۱۰ - ۶ میں تشبیہات میں یوں ارشاد فرمایا " میرا دوست نورانی، گندم گوں، ہزاروں میں سردار ہے۔

اس کا سر ہیرے کا سا چمک دار ہے،......

اس کا چہرہ مانند مہتاب کے، جوان مانند صنوبر کے،

اس کا گلا نہایت شیریں

اور وہ بالکل محمدؐ یعنی تعریف کیا گیا ہے۔

یہ ہے میرا پیارا اور میرا محبوب اے بیٹیو یروشلم کی (مقالات سرسید)

توریت میں خدائے لم یزل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا۔

" میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں تجھ سا ایک نبیؐ پیدا کروں گا۔

اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈال دوں گا، اور جو کچھ میں اسے کہوں گا۔ وہ سب ان سے کہہ دے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔

" لیکن وہ فارقلیط (احمدؐ) پاکیزگی کی روح ہے۔ جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب چیزیں سکھلائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں۔ تمہیں یاد دلائے گا۔ (یوحنا ۲۶/۱۲)

" لیکن وہ فارقلیط (احمدؐ) آکر دنیا کو گناہ سے راستی اور عدالت سے قصور وار ٹھہرائے گا۔ گناہ اس لئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے۔ "

میلاد نبیؐ سے پیشتر الہامی کتب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکار جمیل و محامد و محاسن کو نعت ہی کے تحت لایا جا سکتا ہے لیکن ولادت سے پہلے کے اس واقعے کی تاریخی نوعیت کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ یمن کے ایک بادشاہ تبع نے یثرب پر حملہ کر دیا۔ مدینہ منورہ کو اس زمانے میں یثرب کے نام سے پکارتے تھے اس لڑائی کا ایک عجیب و غریب پہلو یہ ہے کہ اس حملے میں دن کو جنگ ہوتی تھی اور رات کو اہل یثرب تبع کے لشکر کی

عیانت کرتے تبع کے اہل یثرب کی اس عالی ظرفی اور حسن سلوک سے متاثر ہوکر صلح کا ارادہ کیا جب صلح نامہ لکھا جارہا تھا تو توریت کے ایک فاضل بنیامین قرظی نے تبع سے کہا۔

"تم نے اچھا کیا کہ صلح کرلی تم یثرب کو فتح نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ یہ شہر قریشی نبیؐ کی اقامت گاہ بننے والا ہے۔"

تبع پہلے ہی اہل یثرب کے اخلاق سے متاثر تھا یہ بات سنی تو نبی مکرم کی شان میں کچھ اشعار کہے۔

اَتَیٰ اِلَیَّ نَصِیحَۃً کَیْ اَزْدَجِرْ عَنْ قَرْیَۃٍ مَحْجُوْرَۃٍ بِمُحَمَّدٍ

ترجمہ:۔ اس شخص نے مجھے نصیحت کی کہ میں اس آبادی سے ہٹ جاؤں جو محمد کی وجہ سے محفوظ کردی گئی ہے۔

دوسرے دو اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ احمد صلی اللہ علیہ وسلم اس اللہ کے رسول ہیں جو جسموں میں جان پیدا کرنے والا ہے۔ اگر میری عمر اس کی عمر تک لمبی ہوئی تو میں ضرور اس کا وزیر اور ابن عم ہوں گا۔

اسی طرح ولادت نبوی سے پیشتر ایک عربی نعت قس بن ساعدہ نے لکھی۔ یہ شاعر عرب پرانا مدرخطیب تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پیشتر دے بازار عکاظ کے ایک اجتماع میں خطبہ دیتے سنا تھا قس بن ساعدہ توحید اور قیامت کا قائل تھا اس کے دو ایک اشعار یہ ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی لَمْ یَخْلُقِ الْخَلْقَ عَبَثْ

اَرْسَلَ فِینَا اَحْمَد خَیْرَ نَبِیٍّ قَدْ بُعِثْ

صَلّٰی عَلَیْہِ اللّٰہُ مَا حَجَّ لَہٗ رَکْبٌ وَحَثْ

ترجمہ: ہر قسم کی تعریف اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مخلوق کو بے کار پیدا نہیں کیا۔

اس نے ہم میں احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بہترین نبی کے طور پر مبعوث کیا

اللہ ان پر اس وقت تک رحمتوں کا نزول فرمائے جب تک قافلے اس کے لئے حج کرتے ہیں یعنی ہمیشہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے موقع پر کہی گئی اس نعت کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ یہ نعت آنحضرتؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے کہی جب سرور کائنات کی ولادت ہوئی تو حضرت عبدالمطلب کو بے پناہ خوشی حاصل ہوئی انہوں نے اپنے پوتے کو ہاتھوں پر اٹھایا اور خانہ کعبہ کے اندر لائے اور یہ اشعار پڑھے۔

الحمد للہ الذی اعطانی ھذا الغلام الطیب الاردان

قد ساد فی المہد علی الغلمان اعیذہ بالبیت ذی الارکان

حتی یکون بلغۃ الفتیان حتی اراہ بالغ البنیان

اعیذہ من کل ذی شنآن من حاسد مضطرب العنان

ترجمہ:۔ میں اس اللہ کی توصیف کرتا ہوں جس نے مجھے یہ بچہ عطا فرمایا ہے اس کا لباس پاکیزہ ہے۔ وہ گہوارے میں بھی سب بچوں کا سردار نظر آتا ہے۔ میں اسے خدا کے گھر کی پناہ میں لایا ہوں۔ یہاں تک کہ وہ نوجوانوں کا مددگار نے والا اور فصاحت وبلاغت میں یکتا ہو جائے میں بغض اور کینہ کرنے والوں سے اور بے لگام حاسد کے شر سے اس کے لئے پناہ چاہتا ہوں

ولادت نبیؐ کے بعد جو دوسری نعت رسولؐ کہی گئی وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہؓ نے کہی۔

اس زمانے میں عرب میں قاعدہ تھا کہ شہر میں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تو کچھ عرصے کے لئے اسے شہر سے باہر بھجوا دیا جاتا کہ اسے صحراؤں کی کھلی فضاؤں کی تازگی میسر آئے۔ اس مقصد کے لئے ہر سال مکہ میں دایہ عورتیں آیا کرتیں جس برس آپ پیدا ہوئے تو اتفاق سے امیر گھرانوں کے بچوں کو دایہ لے گئیں۔ لیکن قبیلہ بنو سعد کی ایک دایہ حلیمہ سعدیہؓ کو کسی خوشحال گھرانے کا بچہ نہ مل سکا وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سوچ رہی تھیں کہ آپ یتیم ہیں اور اس لیے شاید زیادہ معاوضہ نہ مل سکے حضرت آمنہ نے حلیمہ سعدیہ کا تذبذب دیکھ کر بے ساختہ ان سے مخاطب کیا ان الفاظ کے بارے میں دانشوروں کا خیال ہے کہ یہ باقاعدہ مصرعوں کی صورت میں موزوں ہیں اور مخمس کا بند معلوم ہوتے ہیں۔ وہ بند یہ ہے۔

اُعِیذُ بِاللّٰہِ ذِی الجَلَالِ	مِنْ شَرِّ مَا مَرَّ عَلَی الجِبَالِ
حَتّٰی اَرَاہُ حَامِلِ الجِمَالِ	وَیَفْعَلُ العُرفَ اِلَی المَوَالِیِ

وَغَیرِھِمْ مِنْ حَشْوَۃِ الرِّجَالِ

ترجمہ:۔ میں اپنے اس بچے کو خدائے ذوالجلال کی پناہ میں دیتی ہوں اس شر سے جو پہاڑوں پر چلتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اسے اونٹ پر سوار دیکھوں اور یہ بھی دیکھوں کہ وہ غلاموں اور درماندہ لوگوں کے ساتھ نیکی کرتا ہے؟

حضرت آمنہ کے بعد سب سے پہلے رسول برحق کے عم نامدار ابوطالب نے چند پر جوش اشعار کہے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ عرب ہی شعر کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ شعر خطرناک جنگ بھڑکا سکتے تھے شعر ہی جنگ کی دہکتی دوزخ کو ٹھنڈا کر سکتے تھے شعر سے کنواریوں کے لئے بر میسر آتے۔ اعلان نبوت کے بعد جب قریش نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دشمنی کا وطیرہ اختیار کر لیا اور ابوسفیان نے اس کو بنو امیہ کے خلاف بنو ہاشم کی سازش سمجھ لیا تو ابوطالب نے یہ اشعار کہے،

سیرۃ النبیؐ میں ابن ہشام نے اس قصیدے کے سات اشعار نقل کئے ہیں۔ چند اشعار یہ ہیں۔

وَاللّٰہِ لَنْ یَّصِلُوا اِلَیکَ بِجَمعِھِمْ	حَتّٰی اُوَسَّدَ فِی التُّرَابِ دَفِینَا
خدا کی قسم وہ اپنی جمعیت کے ساتھ تجھ تک ہرگز پہنچ نہیں سکتے	جب تک مجھے دفن کر کے مٹی میں ٹیک لگا کر لٹا نہ دیا جائے
فَاصْدَعْ بِاَمْرِکَ مَا عَلَیکَ غَضَاضَۃٌ	وَابْشِرْ وَقَرَّ بِذَاکَ مِنْکَ عُیُونَا
تو اپنا کام کئے جا تجھ پر کسی قسم کی تنگی نہیں ہے۔	اور خوش رہ اور اس کام کے ساتھ اپنی آنکھیں ٹھنڈی کئے جا
وَدَعَوْتَنِی وَزَعَمْتَ اِنَّکَ نَاصِحِی	وَلَقَدْ صَدَقْتَ وَکُنْتَ ثَمَّ اَمِیْنًا

تو نے مجھے دعوت دی اور تیرا خیال ہے کہ تو میرا خیر خواہ ہے۔ تو نے سچ کہا اور پھر تو تو ایک امانت دار (امین) رہ چکا ہے۔

دَعَوتَ دِیناً لامُحَالَۃَ اِنَّہُ — مِن خَیرِ اَدیانِ البَرِیَّۃِ دِیناً

اور تو نے وہ دین پیش کیا جو یقیناً — دنیا کے ادیان میں بہترین دین ہے۔

لَولَا المَلَامَۃُ اَو حِذَارُ مُسَبَّۃٍ

اگر ملامت کا خوف اور سبکی کا اندیشہ نہ ہوتا

لَوَجَدتَنِی سَمحاً بِذَاکَ مُبِیناً

تو اس دین کو قبول کر لینے میں تو یقیناً مجھے برملا فراخ دل پاتا

یوں تو حضور سرورِ کائنات گلہائے نعت نظم و نثر دونوں اصناف میں پیش کئے گئے اور اس کی مثالیں عہد نبویؐ میں بعض صحابہ کے خطبات کی صورت میں ملتی ہیں یعنی حضرت جعفر طیارؓ کا دربار نجاشی میں خطبہ نثر میں نعت نبیؐ کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے اُردو میں بھی شبلی نعمانی کی معروف نثر ظہورِ قدسی اور علامہ سید سلیمان ندوی کے خطبات مدراس نعت کے نثری شاہکار ہیں لیکن لفظ نعت صرف شعر کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ نعت صنف شعر نہیں، اگرچہ بعض نقادوں اور اساتذہ نے غزل کے اسلوب میں نعت کہی ہے دراصل نعت مدح رسول کے اظہار کا نام ہے۔ یہ غزل مثنوی مسدس یا جدید نظم کی ہر ہیئت میں لکھی جا سکتی ہے اور لکھی گئی ہے حلقہ بگوشانِ نبیؐ نے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنے اپنے انداز میں کیا ہے اس میں شبہ نہیں کہ نعت کی ابتدا عربی زبان سے ہی ہوئی۔ عربی نعت میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ام المومنین بی بی عائشہ صدیقہ اور بی بی فاطمۃ الزہرہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ عربی کے بائیس مقتدر شعراء کا تذکرہ ملتا ہے جنہوں نے ذکر جمیل رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے شعر کا دامن مالا مال کیا۔ ان میں حضرت حسان بن ثابت کو اولیت حاصل ہے دوسرے شعراء میں حضرت عبداللہ بن رواحہ حضرت اُسید بن ابی ایاس الکنانیؓ حضرت مالک بن النمطؓ حضرت ابو عزۃ الجمحیؓ حضرت مالک بن ف النصری، حضرت عمرو بن سبیع الرہاوی، حضرت اُسید بن سلمۃ السلمیؓ، حضرت عباس بن عبد المطلبؓ، حضرت العباس بن مرداس السلمیؓ، حضرت ابو سفیان بن الحارثؓ حضرت اعشی بکر بن وائلؓ، حضرت الاعشی المازنیؓ حضرت کلیب بن اسید الحضرمیؓ، حضرت نابغہ الجعدیؓ، حضرت قیس بن بحر الاشجعیؓ، حضرت فضالۃ اللیثیؓ حضرت مازن بن الغضوبہ الطائیؓ، حضرت عبداللہ بن الزبعریؓ، حضرت کعب بن مالکؓ حضرت کعب بن زہیر مکیؓ، حضرت عمرو بن مالک الخزاعیؓ پھر شیخ علامہ بوصیری مصری نے قصیدہ بردہ لکھ کر شہرت و مقبولیت کی معراج حاصل کی۔

مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الکَونَینِ وَالثَّقَلَین — وَالفَرِیقَینِ مِن عُربٍ وَمِن عَجَمٍ

(محمد سردار ہیں دونوں جہانوں کے، دونوں اہم مخلوق یعنی جن وانس کے اور عرب و عجم دونوں گروہوں کے)

نَبِیُّنَا الآمِرُ النَّاہِی فَلا اَحَدٌ — اَبَرَّ فِی قَولِ لَا مِنہُ وَلَا نَعَمِ

(آپ ہمارے نبی ہیں، اچھائیوں کا حکم دینے والے اور برائیوں سے روکنے والے پس آپ کے مقابلے میں ہاں اور نہیں کے اعتبار سے زیادہ سچا دوسرا کوئی نہیں۔

هو الحبیب الذی ترجی شفاعتهٗ لکل هولٍ من الاهوال مقتحم

آپ ہی اللہ کے وہ حبیب ہیں جن کی شفاعت کی آس پر خوف و ہراس میں اور قیامت کی شدید گھڑیوں میں لگائی جا سکتی ہے)

فارسی زبان کے شعرائیں کم و بیش ہر ایک نے نعت کہی لیکن خاقانی، جامی عرفی، فردوسی طوسی سنائی عمر خیام نظیری، نظامی رومی، عطار خواجہ معین الدین چشتی، قدسی اور شیخ سعدی کا نعتیہ کلام بہت مقبول ہوا خصوصی طور پر قدسی اور شیخ سعدی کا کلام اثر و تاثیر اور حُبِ نبی کا شاہکار ہے۔ شیخ سعدی کا یہ معروف نعتیہ قصیدہ لطافت، ترنم اور عقیدت میں لاثانی ہے۔

بلغ العلیٰ بکمالہٖ کشف الدجیٰ بجمالہٖ

حسنت جمیع خصالہٖ صلوا علیہ وآلہٖ

قدسی کی اس نعت کو بقائے دوام کی سند حاصل ہو چکی ہے۔

مرحبا سید مکی مدنی العربی دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

اردو ادب میں نعت کی ابتدا ادب کی ابتدا کے ساتھ ہی ہوئی۔ دکن میں بہمنی دور میں سید محمد حسینی جو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے نام سے شہرت رکھتے ہیں اور ان سے دکنی زبان میں سب سے پہلا رسالہ معراج العاشقین کے نام سے منسوب ہے ان کا جو منظوم کلام دستیاب ہوا ہے۔ اس میں نعتیہ اشعار بھی ہیں۔

لولاک لما خلقت الافلاک خالق پالائے

خاص افضل جتنے مرسل ساجد مسجود ہوائے

امت رحمت بخشش ہدایت تشریف پائے

دکن میں ابتدائی دور میں نعت کا اسلوب غزل طور نہ تھا بلکہ مثنوی اور نظم کی بعض دوسری اصناف میں تھا۔ قطب شاہی دور میں بلاتی نے ۱۰۸۱ھ میں مثنوی کی صنف میں پندرہ سو اشعار پر مبنی؛ معراج نامہ لکھا اس کی تقلید ۱۰۹۳ھ میں مختار نام کے ایک شاعر نے کی۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی نعت اردو شاعری کی تاریخ کے اولین حسین و دلکش نقوش کی حیثیت رکھتی ہے۔

جیتا توں دل و جیو سوں قرآن دیکھے احمد کے سوچ پرتوں سب احسان دیکھے

دیکھ حلقۂ خاتم النبیںؐ میں توں دل میں موں تا رینج رحمان دیکھے

ان کے بعد کے اکثر و بیشتر دینی شعرا کے ہاں نعت ملتی ہے۔ ولی نے بھی جسے اردو کا پہلا قابل ذکر شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ نعتیہ اشعار رکھے چنانچہ ان کے دیوان میں جا بجا حُبِ رسول اشعار کی صورت میں نظر آتی ہے۔ سادگی اور خلوص ان کے نعتیہ کلام کا خاصہ ہے

عشق میں لازم ہے اول ذات کوں فانی کرے ہو فنا فی اللہ، دائم یاد یزدانی کرے

زندگی پاوے ابد کی جگ مینں وہ خضر وقت | جو اپس کو فدوی محبوب سبحانی کرے
یا محمد دو جہاں کی عید ہے تجھ ذات سوں | خلق کو لازم ہے جی کوں تجھ پہ قربانی کرے
دیکھ خوبی قد ترا جنبش میں آوے شوق سوں | جب گلستانِ ارم کی تو خرامانی کرے

عارفاں بولیں گے جان و دل سوں لاکھوں آفریں
جب ولیؔ تیری مدح میں گوہر افشانی کرے

ولی سے سوداؔ تک اردو شاعری نے ترقی کی منزلیں بہت جلد طے کیں۔ میرؔ و مرزاؔ کے زمانے میں اردو شاعری معراج کو پہنچ گئی اور اس میں زبان و بیان کی تبدیلی نئے نئے اسلوب، تنوع اور نزاکت پیدا ہوئی میرزا سوداؔ کی غزلوں اور قصیدوں کی طرح ان کے نعتیہ کلام میں بھی شوکت و دبدبہ موجود ہے۔

عجب ناداں ہیں جن کو ہے عجب تاج سلطانی | فلک بال ہما کو پل میں سونپے ہے مگس رانی
نہ ہے دین محمدؐ پیروی میں ہوں اس کے جو سودیں | نہ ہے خاکِ قدم سے ان کے چشم عرش نورانی
جہاں انصاف سے ہر گاہ اب معمور ہے اتنا | تو اس سے آگے ہوگی عدل کی کیا کچھ فراوانی
ہزار افسوس اے دل ہم نہ تھے اس وقت دنیا میں | وگرنہ کرتے یہ آنکھیں جمال اس کے سے نورانی

سودا کے کلام میں شوکت و دبدبہ کے باوجود عجز و عقیدت بھی موجود ہے اور یہی چیز سودا کو نعت گوئی میں بھی ایک بلند مقام بخش دیتی ہے۔

اردو شاعری کے قدیم دور میں مولانا باقر آگاہ کی حبِ رسول کا ثبوت ان کی کتاب سیرت النبیؐ "ہشت بہشت" ہے۔ انہوں نے اس کتاب کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا اور اسی نسبت سے اسے "ہشت بہشت" نام دیا باب ہفتم یعنی من درین میں، معجزات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں ایک شعر ملاحظہ ہو۔

ہے وہ ام الکتاب و نور قدسی | کہ جس کی آیت الکرسی ہے کرسی

دور متوسطین میں بھی نعت رسول ؐ کا رجحان عروج پر رہا۔ شعرا نے قرآن و سیرت کی ہم آہنگی کو آئینہ شعر میں دکھایا۔ اس دور میں ناسخ غلام امام شہید، کرامت علی شہیدی، مومن خان مومن، بہادر شاہ ظفر، انیس و دبیر سب نے نعت لکھ کر حبِ رسول کا ثبوت دیا۔

معانی قل ھو اللہ احد کے ہیں یہاں ناسخؔ
برائے قافیہ رکھا ہے میں نے میم احمد کا (ناسخؔ)

غلام امام شہید کی شہرت بھی نعت گوئی کی وجہ سے ہے وہ اردو میں قتیل اور مصحفیؔ کے شاگرد تھے اور فارسی میں آغا سید اسمٰعیل سے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ عاشق رسول کے طور پر شہرت حاصل کی، غزل، مثنوی ترجیع بند میں نعتیہ اشعار

کیے مضامین میں وسعت پیدا کی۔

مداح ہوں جناب رسالت پناہ کا	عرش بریں پہ گوشہ ہے میری کلاہ کا
محفل میں میری نغمہ سرائی سے شور ہے	ہر سمت آہ آہ اور واہ واہ کا۔
زیبا ہے فخر وناز مجھے جس قدر کروں	دیکھو تو مدح خواں ہوں میں کس بادشاہ کا
پیغمبروں کو فخر ہوا اس کی ذات پر	سردار ہی سے بڑھتا ہے رتبہ سپاہ کا۔
درپیش ہے عدم کا سفر سب کو دوستو	جو نعت کا کلام ہے توشہ ہے راہ کا

کرامت علی شہیدی بھی غلام امام شہید کے ہم عصر تھے وہ پہلے مصحفی اور پھر شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد ہوئے انہوں نے نعت کی طرف مکمل توجہ دی اور نعتیہ دیوان مرتب کیا۔

طلوع روشنی جیسے نشاں ہو شہ کی آمد کا
ظہور حق کی حجت ہے جہاں میں نور احمد کا
تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

گلگشت گلستاں پہ پڑھو صلی علیٰ تم	ہر پھول کی پتی میں رچی بوئے محمدؐ

اسی دور میں لطف بریلوی نے بھی اپنی تمام تر شاعرانہ صلاحیتیں نعت کے بیان کے لئے وقف کر دیں۔

خداوند دو عالم ہے ترا مداح قرآں میں	تری تعریف لکھنے کی کہاں طاقت ہے انساں میں

اس دور کے بعد لکھنؤ کی شاعری میں نسوانیت رچنے لگی درباداری کے آداب اور طور طریقوں، تکلف اور تصنع نے ادب پہ بھی اثر ڈالا اور قصیدہ کا عکس نعت میں بھی جھلکنے لگا۔ چنانچہ اس کا اندازہ میر حسن کے ہاں اس ابتدائی نعتیہ ٹکڑے سے کیا جا سکتا ہے۔

نبوت جو کی حق نے اس پر تمام	لکھا اشرف الناس خیر الانامؐ
بنایا سمجھ بوجھ کر خوب اسے	خدا نے کہا اپنا محبوب اسے
کروں اس کے رتبے کا کیا میں بیاں	کھڑے ہوں جہاں باندھ صف مرسلاں
مسیح اس کے خرگاہ کا پارہ دوز	تجلی طور اس کی مشعل فروز
خلیل اس کے گلزار کا باغباں	سلیماں کئی پہرہ دار اس کے ہاں
خضر اس کے سرکار کا آبیار	نذرہ ساز داؤد سے واں ہزار
محمدؐ کے مانند جگ میں نہیں	ہوا ہے نہ ایسا، نہ ہو گا کہیں

لکھنؤ کے مرثیہ گو شعرا نے مرثیے میں اپنی ثقافت اور معاشرت کا جو رنگ شامل کیا اور عرب کے رنگ روپ کو جس

طور مقامی رنگ دیا اس نے غمِ حسین کو غمِ ذات کے درجے پر پہنچا دیا۔ یوں ماحول بدلا لیکن اس کا اثر جذبے کو تیز کرنے میں بڑا ممد ثابت ہوا۔ انیس نے نعت کو مسدس کے منفرد انداز میں ڈھالا۔

منظور تھا کہ اور روایت کروں رقم　　یاد آگئی مگر یہ حدیث غم و الم
مسجد میں جلوہ گر تھے رسولِ فلک حشم　　ملتے تھے ذکرِ حق میں لبِ پاک دم بدم
روشن تھے بام و در رخِ روشن کے نور سے
آئینہ بن گئی تھی زمین تن کے نور سے

اصحابِ خاص گرد تھے انجم کی طرح سب　　تاباں تھا بیچ میں وہ مہِ ہاشمی لقب
سر پر ملک صفات مگس راں تھے وہ عرب　　جبریل طے کئے ہوئے تھے زانوئے ادب
خادم بلال قنبر گردوں اساس تھا
نعلین اس کے پاس، عصا اس کے پاس تھا

گیسو تھے وہ مفسرِ واللیلِ اذا سجیٰ　　رخ سے عیاں تھے معنیٔ والشمس والضحیٰ
وہ ریشِ پاک اور رخِ سردارِ انبیا　　گویا دہرا تھا رحل پہ قرآن کھلا ہوا
اوڑھے ہے سیاہ جبہ جو عالم پناہ تھا
کعبہ کا صاف حاجیوں کو اشتباہ تھا

میرزا دبیر نے رباعیات میں ذکرِ خیر البشر پرویا۔

کیا قامتِ احمد نے ضیا پائی ہے　　چہرے میں عجب نور کی زیبائی ہے
مصحف کو نہ کیوں فخر ہو اس صورت پر　　قرآن سے پہلے یہ کتاب آئی ہے
—
آدم نے شرف خیر البشر سے پایا　　رشتہ ایماں کا اس گہر سے پایا
وہ میم محمد سے جہاں روشن ہے　　مضموں یہ دلِ شمس و قمر سے پایا
—
معراج نبیؐ میں جائے تشکیک نہیں　　ہے نور کا تڑکا، شبِ تاریک نہیں
قوسین کے قرب سے یہ صادق ہے دبیرؔ　　اتنا کوئی اللہ کے نزدیک نہیں

اس کے بعد بیسویں صدی کے شروع تک بہت زیادہ نعتیں لکھی گئیں تقریباً ہر صنف میں۔ شاعر نے نعت لکھی۔ اس دور میں جس قدر دیوان دستیاب ہوتے ہیں کم و بیش ہر ایک میں کم از کم ایک آدھ نعت ضرور شامل ہے۔
اس عہد میں نعت میں دو رجحانات ملتے ہیں۔ اور دونوں میں عشقِ مجازی کا سہارا لیا گیا ہے۔ پہلی صورت میں محبوب کے سراپے، حسن و جمال اور ظاہری معشوقانہ محاسن کو ذاتِ اقدس سے منسوب کیا جانے لگا۔ ایسے شعرا میں بیاذ وغیرہ دانی

کسی ذہنی عارضے کی وجہ سے ایام جوانی ہی میں وہم کا شکار ہو گئے اور شور سے گھبرانے لگے۔ یہ ان شعرا میں سے ہیں جنہوں نے شعر گوئی کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا۔ اگرچہ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے لیکن ان کے کلام پر ناسخ کا واضح اثر نظر آتا ہے۔ بیان یزدانی کے کلام میں مجازی تاثر نمایاں ہے اور عوام میں مقبول بھی ہوا ان کی ایک مشہور نعت کے چند شعر درج ہیں

خواب میں زلف کو مکھڑے سے ہٹائے آجا — بے نقاب آج تو اے گیسوؤں والے آجا

بیکسی پر مری خوں روتے ہیں چھالے آجا — راہ میں چھوڑ گئے قافلے والے آجا

کون ہے ماہ عرب، کون ہے محبوب خدا — اے دو عالم کے حسینوں سے نرالے آجا

ہوں سیہ کار مرے عیب کھلے جاتے ہیں — کملی والے مجھے کملی میں چھپالے آجا

پہنچا محبوب تو مشاطۂ رحمت نے کہا — خلوت راز میں اے ناز کے پالے آجا

رنگ وحدت ہے یہاں، غنچۂ خلوت ہے یہاں — اے گل گلشن لولاک لما، لے آجا

صورت لالہ ہے پر داغ بیاں کا سینہ — پڑ رہے ہیں ترے بیمار کے لالے آجا

اس دور میں اردو نعت میں ہندی کا تتبع کیا جانے لگا۔ اور اس میں عورت کے جذبات کی ترجمانی کی جانے لگی۔ عورت کی زبان میں نعت کا انداز کچھ اس طرح ہو گیا کہ شاعر اپنے پیا کی کھوج میں جوگن کا بھیس بدل کر مدینے کی گلیوں میں پکارتا پھرتے لگا، بعض لوگوں کے نزدیک نعت کا یہ رجحان غیر پسندیدہ تھا اور اس لئے زیادہ پنپ نہ سکا

متاخرین میں بیان یزدانی کے علاوہ امیر مینائیؒ نے بھی ذات ستودہ صفات صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے جذبات کا نعت کی صورت میں اظہار کیا ان کا تیسرا دیوان "محامد خاتم نبیین" نعت میں ہے۔ صاحب "گل رعنا" کا خیال ہے کہ اس دیوان کی خصوصیت یہ ہے کہ نعت کا وہ مذموم طریقہ جس میں شاعر مبالغہ کے ساتھ دیگر انبیائے کرام کے جناب میں گستاخی کا پہلو نکالتا ہے اس کو چھوڑ کر نئی راہ نکالی ہے"

سکہ رائج جب سے دین مصطفےٰ کا ہو گیا — غلغلہ ساری خدائی میں خدا کا ہو گیا

اوّل بعثت میں ختم الانبیاؐ پایا لقب — رتبہ حاصل ابتدا میں انتہا کا ہو گیا

روح نے جلوہ جو دیکھا آپ کا قندیل عرش — آشیانہ اس گرفتار بلا کا ہو گیا

دونوں رخساروں کی مدحت میں ہوا موزوں جو شعر — ترجمہ شمس الضحیٰ بدر الدجیٰ کا ہو گیا

امیر مینائیؒ نے "ذکر شاہ انبیاؐ" کے عنوان سے مولود شریف بھی تصنیف کیا ہے۔ یہ اس نثری میلاد کی کتاب کے علاوہ ہے جو انہوں نے "خیابان آفرینش" کے نام سے لکھی۔ "صبح ازل" ولادت باسعادت" اور "شام ابد" وصال سرور کائنات پر محیط ہے۔ "لیل القدر" میں معراج نبی صلعم کا حال ہے۔ امیر مینائیؒ کی صلی اللہ علیہ وسلم کی ردیف میں یہ نعت بھی بہت مقبول ہوئی۔

خلق کے سرور، شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم — مرسل داور خاص پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم

نور مجسم، نیر اعظم، سرور عالم، مونس آدم — نوح کے ہمدم، خضر کے رہبر صلی اللہ علیہ وسلم

قبلۂ عالم، کعبۂ اعظم، سب سے مقدم، راز کے محرم — جانِ مجسم، روحِ مصوّر، صلی اللہ علیہ وسلم
دولت دنیا خاک برابر ہاتھ کے خالی، دل کے تونگر — مالکِ کشور، تخت نہ افسر، صلی اللہ علیہ وسلم
مہر سے مملو ریشہ ریشہ، نعت امیرؔ ہے اپنا پیشہ — وِرد ہمیشہ رہتا ہے لب پر صلی اللہ علیہ وسلم

امیر مینائی کے نامور شاگردوں میں ریاض خیرآبادی، جلیل مانک پوری، مضطر خیرآبادی اور محسن کاکوروی قابلِ ذکر ہیں۔ ریاض خیرآبادی نے جب بھی نعت رسول ؐ کی جانب توجہ کی تو خمریات سے ہٹ کر بات کی

نام کے نقش سے روشن یہ نگینہ ہو جائے — کعبۂ دل مرے اللہ مدینہ ہو جائے

اسی دور میں میر مہدی مجروح نے بھی نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہی۔ مجروح کی زبان امیر مینائی سے زیادہ صاف، سادہ اور آسان ہے شعر گوئی کا ذوق ورثے میں پایا تھا۔ ان کے والد میر حسن نگار بھی شعر کہتے تھے۔ غالب کے شاگرد تھے اور غالب کے منظورِ نظر بھی تھے۔ لیکن غالب کی مشکل پسندی نہ اپنائی نعت کے نمونے ملاحظہ ہوں۔

کیا کہوں میں کہ کیا محمدؐ ہے — ایک نورِ خدا محمدؐ ہے۔
محفلِ قرب کی خبر کس کو — واں تو اللہ یا محمدؐ ہے۔
میرے دل کے نگیں پہ اے مجروحؔ — نقش صلِّ علیٰ محمدؐ ہے۔

—

خدا جس کی کرے خود میزبانی — کہو کیسا معزز میہماں ہے۔
ہوا ثابت یہ معراجِ نبیؐ سے — کہ واں کوئی نہیں ہے، وہ جہاں ہے۔
وہ ہے دنیا کی پیدائش کا باعث — وہ آدم کا چراغِ دودماں ہے۔
ہوا ثابت یہ پیدائش سے اس کی — خدا بندوں پہ اپنے مہرباں ہے۔

نہ صرف اس دور بلکہ ہر دور کی صنفِ نعت میں سب سے نمایاں شخصیت محسن کاکوروی کی ہے۔ وہ نہ صرف اُردو کے نعتیہ ادب بلکہ مشرقی زبانوں کے نعتیہ ادب میں بھی اپنے رتبے کے تنہا مالک ہیں جس طرح میر انیس نے اپنی زندگی مرثیہ نگاری کے لئے وقف کر دی۔ اسی طرح محسن کاکوروی نے تمام زندگی توصیفِ نبی اکرمؐ میں گذاری، انہیں خود بھی اپنی نعت گوئی پر ناز تھا۔

سخن کو رتبہ ملا ہے مری زباں کے لئے — زباں ملی ہے مجھے نعت کے بیاں کے لئے
ازل میں جب ہوئیں تقسیم نعمتیں محسنؔ — کلامِ نعتیہ رکھا مری زباں کے لئے

محسن کے کلام میں عشقِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ امڈ پڑتا ہے محسن کی نعت اس دور میں اور زیادہ اہم درجہ و رتبہ حاصل کر گئی جبکہ لکھنؤ میں اردو غزل نشاطِ ہوس کا پلندہ بن گئی تھی مرثیہ گوئی اور نعت نے غزل کے ابتذال کے مقابلے میں جذبات کی تطہیر کا اہم کام کیا محسن نے نعت کو مختلف اصنافِ سخن میں برتا مسدس میں سراپائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم لکھا ان کے کلام میں قصیدے کی صورت میں مدیح خیر المرسلین بے حد مقبول ہوئیں طویل مثنویاں نعتیہ شاعری میں بہت اونچا رتبہ رکھتی ہیں پہلی مثنوی ولادت باسعادت کے بیان میں ہے دوسری معراجِ مبارک اور

تیسری احوال قیامت اور قیامت میں جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت پر ہے۔ اسی طرح انہوں نے مخمس رباعیات اور غزلیات بھی کہی ہیں۔ ان کا نعتیہ قصیدہ اردو ادب میں کلاسیکی درجہ رکھتا ہے اور اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

اس قصیدے میں نعت کا زورِ خلوص اور حسن اثر ان اشعار میں ملاحظہ ہو۔

باغ تنزیہہ میں سرسبز نہال تشبیہ
انبیا جس کی ہیں شاخیں ثمر فاہیں کونپل

گل خوش رنگ رسول مدنی العربی
زیب دامانِ ابد، طرۂ دستارِ ازل

مہر توحید کی ضو، اوج شرف کا مہِ نو
شمع ایجاد کی لو، بزم رسالت کا کنول

اوج رفعت کا قمر نخل دو عالم کا ثمر
بحر وحدت کا گہر، چشمۂ کثرت کا کنول

نہ کوئی اس کا مشابہ ہے نہ ہمسر نہ نظیر
نہ کوئی اس کا مماثل نہ مقابل نہ بدل

ہفت اقلیم ولایت میں شہ عالی جاہ
چار اطراف ہدایت میں نبی مرسل

ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی
نہ مرا شعر، نہ قطعہ، نہ قصیدہ نہ غزل

دین دنیا میں کسی کا نہ سہارا ہو مجھے
صرف تیرا ہو بھروسہ تری قوت ترا بل

صف محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مداح
ہاتھ میں لئے مستانہ قصیدہ، یہ غزل

کہیں جبریل اشارے سے کہ ہاں بسم اللہ
سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

مسدس میں چہرۂ اقدس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

روبرو آئے جو آئینہ تو اک سکتا ہو
شمع کے بھی دھوئیں اڑ جائیں جو کچھ دعویٰ ہو
شامت آجائے جو خورشید کو یہ سودا ہو
صبح ہو جائے قمر حسن پہ گر بھولا ہو
حشر برپا ہو جو کنعانی مقابل آئیں
چرخ پر سورۂ یوسف کو ملک لے جائیں

غزل کے اشعار یوں ہیں۔

مصحف کا ایک صفحہ جبیں ہے جناب کی
تقریظ حق نے لکھی ہے اپنی کتاب کی

تاحشر تیری مدح سے ہو میری آبرو
اشراق اسی وضو سے ہو روز حساب کی

ولادت باسعادت پر مثنوی کے اشعار میں شاعر کی محبت، جذبے، علمیت، قادرالکلامی اور شعری محاسن امڈے پڑتے ہیں

القصہ یہ دیکھ کر تماشا
حیرت ہوئی آ کے جلوہ فرما

کہتی ہوئی کیا ہے آج ساماں
کھلتا نہیں کچھ یہ سرِ پنہاں

خورشید فلک کے سائباں میں | یوسف ہے غبار کارواں میں
خلوت گہہ حسن ہے زمانہ | اور جلوۂ صبح شاہدانہ
کرتا ہے فلک سجود پیہم | مائل بہ زمیں ہے عرش اعظم
مرکز کو چلی گئی ہے کیا نار | آتش کدے گل ہوئے جو یک بار
چلتے ہیں یہ کس ہوا کے جھونکے | ہوش اڑتے ہیں جس سے کانوں کے
باندھا دہ قضا نے اموی کالام | ابلیس کی فوج میں ہے کہرام
بت مہر سکوت بر دہاں ہے | بت خانوں میں شورِ الاماں ہے
کس کی شوکت کا زلزلہ ہے | قصر کسریٰ جو ہل رہا ہے
ہے کس کو خطاب ایزد پاک | لولاک لما خلقت الافلاک

یہی وہ دور ہے کہ شاعری جدیدیت سے آشنا ہوتی۔ جدید دور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے برصغیر میں مسلمانوں کے زوال نے انہیں مذہب کی طرف مائل کیا۔ اس دور میں مولانا الطاف حسین حالی مولانا شبلی نعمانی مولانا محمد احمد رضا خان بریلوی، مولانا حسن رضا خان بریلوی اور مفتی غلام سرور لاہوری نے اس صنف کی طرف خلوص اور سنجیدگی سے توجہ دی۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اس صنف کو ایک نئی زندگی بخشی۔ ان کے دل میں اسلام کا حقیقی درد تھا۔ انہوں نے صالح جذبات کی روانی اور کمال عقیدت کو ادب کے جدید اور معیاری سانچوں میں ڈھالا۔ مسدس ان کا شعری کارنامہ ہے، اور نہ صرف نعتیہ ادب بلکہ اردو ادب میں سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کے مسدس کے نعتیہ ٹکڑے اپنے اثر اور روانی کے لحاظ سے بے مثل ہیں

یکایک ہوئی غیرت حق کو حرکت | بڑھا جانب بوقبیس ابر رحمت
ادا خاک بطحا نے کی وہ ودیعت | چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل و نوید مسیحا[۴]

ہوئے محو عالم سے آثار ظلمت | کہ طالع ہوا ماہ برج سعادت
نہ چھٹکی مگر چاندنی ایک مدت | کہ تھا ابر میں ماہتاب رسالت

یہ چالیسویں سال لطف خدا سے
کیا چاند نے کھیت غار حرا میں

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا | مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا | وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماوا
یتیموں کا والی غلاموں کا مولا

خطاکار سے درگذر کرنے والا
بداندیش کے دل میں گھر کرنے والا
حاسد کا زیر و زبر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مولانا شبلی نعمانی نے سیرت النبیؐ کو سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مطہر کو جس محبت اور عقیدت سے لکھ کر اردو زبان کو ایک لازوال کتاب دی، اسے ہم نعت منثور کا درجہ دے سکتے ہیں۔ مولانا شبلی نے اپنی شاعری میں خیر البشر کی حیات کے چند واقعات کو منظوم کیا ان نظموں میں نعت کے چیدہ چیدہ اشعار ملتے ہیں۔ "جدید نظمیں" کے عنوان سے انھوں نے اپنی کلیات میں مذہبی و اخلاقی نظموں کا ایک الگ باب قائم کیا ہے جس میں ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، تعمیر مسجد نبوی صلعم، ایک خاتون کی آزادانہ گستاخی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلم اور عفو، اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی (جو مولانا مرحوم کی آخری نظم ہے)، ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر، مساوات اور دوسری مذہبی نظمیں شامل ہیں۔

مولانا حالی کی جدیدیت کا حسن نکھر کر مسدس مد و جزر اسلام میں ابھرا تو اس کا اثر بعد میں آنے والے قومی شعرا میں خود ظفر علی خان اور علامہ اقبال نے لیا لیکن اسی دور میں نعت کی تاریخ کا ایک اور روشن ستارہ بھی طلوع ہو چکا تھا۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی ایک سچے مسلمان اور عالم و فاضل شخص تھے۔ وہ عشق رسولؐ سے مشرف تھے اور ظاہر و باطن میں ان کا یہ عشق یکساں طور پر عروج پر تھا۔ حضرت احمد رضا خان نے غزل سرائی نہیں بلکہ مناجات، نعت، مناقب اولیاؒ اور سلام کہہ کر اپنی زندگی اور عاقبت سنوارتے رہے۔ ان کے کلام میں عقیدت، جذبہ اور سوز بدرجہ اتم ملتا ہے وہ اپنی شاعری کے اس پہلو پر خود فرماتے ہیں

ہوں اپنے کلام سے نہایت محظوظ
بے جا سے ہے المنۃ للہ محفوظ
قرآں سے میں نے نعت گوئی سیکھی
یعنی رہے احکام شریعت ملحوظ

ان کا یہ سلام زبان زد خاص و عام رہا ہے۔

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمع بزم ہدایت پہ لاکھوں سلام
جس کے ماتھے شفاعت کا سہرا رہا
اس جبین سعادت پہ لاکھوں سلام
رب اعلیٰ کی نعمت پہ اعلیٰ درود
حق تعالیٰ کی جنت پہ لاکھوں سلام

شعرگوئی ان کی خاندانی روایت کا حصہ ہے انہوں
مولانا کے چھوٹے بھائی مولانا حسن رضا خاں بریلوی نے بھی شعر کہے
نے داغ اور اپنے برادر بزرگ سے شاعری میں اصلاح لی. حج بیت اللہ کو گئے تو غزل سرائی چھوڑ کر نعت گوئی کو
اپنایا، اور ذوقِ نعت ۱۳۲۶ھ کے تاریخی نام سے مجموعہ نعت شائع کیا.

مولانا حسن رضا خان کا انداز شاعری فصاحت و بلاغت لئے ہوتے ہے، زبان میں حلاوت ہے زبان و محاورہ
کا بطور خاص خیال رکھا ہے. نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں.

عاصیوں کو در تمہارا مل گیا — بے ٹھکانوں کو ٹھکانہ مل گیا
آنکھیں پرنم ہو گئیں سر جھک گئے — جب ترا نقشِ کفِ پا مل گیا
ان کے طالب نے جو چاہا پا لیا — ان کے سائل نے جو مانگا مل گیا

طور نے تو خوب دیکھا جلوہ شانِ جمال — اس طرف بھی اک نظر اے برقِ تابانِ جمال
عاشقوں کا ذکر کیا معشوق عاشق ہو گئے — انجمن کی انجمن صدقے ہے اے جانِ جمال
خوبرویانِ جہاں کو بھی یہی کہتے سنا — تم ہو شانِ حسن، جانِ حسن، ایمانِ جمال
سب سے پہلے حضرت یوسف کا نامِ پاک ہوں — میں گناہوں گر تر نے امیدوارانِ جمال
کھلا دو غنچہ دل صدقہ بادِ دامن کا — امیدوارِ نسیمِ بہار ہم بھی ہیں

اردو کی قومی شاعری میں علامہ اقبال کا رتبہ بہت بلند ہے. انہوں نے شاعری کو مقصدیت کا حسن عطا کیا. اسلام اور قرآن
ان کی شاعری کی شہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں. ان کی شاعری برصغیر کی حدود کو پھاند کر اسلامی دنیا میں پھیلی. وہ ایک وسیع تر
اسلامی برادری اور اسلامی جغرافیائی وسعتوں کے صورت گر تھے. ظاہر ہے کہ جو شاعر اسلام کو اپنی شاعری کا مرکز و محور بنائے
وہ اسلام کے داعی کی ذات والا صفات سے ایک لحظہ کے لئے بھی نظر نہیں ہٹا سکتا. بعض نقاد علامہ اقبال کو حالی کے
بعد سب سے بڑا مجدد کہتے ہیں. یہ دوسری بات ہے کہ انہوں نے روایتی انداز میں ابتدا ہی میں ایک غزل لکھی لیکن
اس نعت کو کسی مجموعے میں شامل نہیں کیا.

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردہ میم کو اٹھا کر — وہ بزم یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

ان کا عشق رسول کا حقیقی جذبہ ان کی کئی نظموں میں ابھرتا ہے، نظموں کے ایسے ٹکڑے حقیقی نعت کا خلوص، حضور
رسالت مآب سے اقبال کی والہانہ محبت اور حد درجہ عقیدت اور بے اختیار سپردگی کی لذت کے مظہر ہیں.

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب — گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود — فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب
عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ — ذرّہ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

شوق اگر ترانہ ہو میری نماز کا امام — میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہ ناز سے دونوں مراد پا گئے — عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب

تیرہ و تار ہے جہاں، گردش آفتاب سے
طبع زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

اس ٹکڑے کا ایک مصرعہ — لوح بھی تو قلم بھی تو — تیرا وجود الکتاب
معنی کی بے پناہ وسعتیں اور بلاغت کی بے حدود دنیا لیے ہوئے ہے۔

غزل میں حکیم سنائی کے مزار پر حاضری دینے کے بعد علامہ نے جو نعت کہی اس کے اشعار جذبے کی رفعت زبان و بیان کی لذت بے ساختہ پن، نغمگی اور تاثیر کی معراج ہیں

وہ دانائے سبل، مولائے کل ختم الرسل جس نے — غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا
نگاہ عشق میں مستی میں وہی اول، وہی آخر — وہی قرآں، وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

علامہ کے ان اشعار میں بھی ان کی محبت اور عجز کا خوبصورت اظہار ملتا ہے۔

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے — دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے
کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم — وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری

علامہ کے عشق رسول کا یہ عالم تھا کہ مختلف موضوعات پر نظمیں لکھتے ہوئے بھی ذات رسالت مآب کا تصور ان پر حاوی رہتا جواب شکوہ میں پوری نظم کا حاصل ایک شعر بن جاتا ہے اور وہ خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و فضیلت کی ترجمانی کرتا ہے۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں — یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

یا حضرت ابو بکر صدیقؓ کے الفاظ میں ان کے جذبات نعت بن کر ابھرتے ہیں

پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس
صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس

اقبال کے کلام میں سرزمین حجاز سے محبت و عقیدت کا اظہار بھی اس ذات گرامی کے تعلق سے ہے اور اس دانائے راز کی زندگی کے آخری لمحات میں آخری اشعار تک برقرار رہتا ہے۔

اوروں کو دیں حضورؐ یہ پیغام زندگی — میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں
ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبال — اڑا کے مجھ کو غبار رہ حجاز کرے
سالار کارواں ہے میر حجاز اپنا — اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا

جدید دور میں علامہ اقبال کے بعد مولانا ظفر علی خاں نے نعت گوئی میں کمال پیدا کیا۔ مولانا ظفر علی خان کی شاعرانہ صلاحیتیں اور فنِ شعر پر ان کی دسترس سے کسی کو انکار نہیں۔ وہ بھی نعت میں مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں جس قدر ان کا نعتیہ کلام مقبول ہوا۔ اس کی مثال کم ملتی ہے۔ ان کی نعت میں جذبہ و فکر، شعور و محبت سے آمیز ہو کر فن کے تمام لوازمات کے ساتھ ظہور پذیر ہوئے ہیں

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے بازاروں میں،
ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی، بوبکر و عمر عثمان و علی
ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبی کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

مولانا ظفر علی خان ایک عظیم اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ہنگامی اور سیاسی شاعری کی وجہ سے وہ روایتی قدروں سے دور ہو گئے لیکن ان کا حسن تنوع، حسن ذوق اور حسن طباعی جب نعت میں آیا تو ان کے جوش عقیدت و جذبہ فراواں کی آمیزش سے لازوال ہو گئی۔ ان کی نعتیہ شاعری اردو شعر کی تاریخ کا بیش بہا خزینہ ہے ان کی یہ نعت اپنی خوبیوں کی حامل ہے۔ اور ہر اردو جاننے والے مسلمان کی زبان پر ہے۔

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمہی تو ہو — ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تم ہی تو ہو
پھوٹا جو سینۂ شب تار الست سے — اس نورِ اولین کا اجالا تمہی تو ہو
گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے — اے تاجدار یثرب و بطحا تمہی تو ہو
اس محفلِ شہود کی رونق تمہی سے ہے — اس محمل نمود کی لیلیٰ تمہی تو ہو
جلتے ہیں جبرئیل کے پر جس مقام پر — اس کی حقیقتوں کے شناسا تمہی تو ہو

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی جد و جہد کے عنوان ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر اپنے آپ کو دیوانہ کہتے تھے۔ لیکن ان کی دیوانگی قوم و مذہب، وطن اور تمینوں کے لیے تھی، جہاں وہ تحریک آزادی کے علمبردار اور رہنما تھے وہاں اسلام اور جذبہ اسلام کی بقا کے لیے بھی ان کی محبت اور قربانیاں کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ان کا اسلام اور مسلمان کے بارے میں جو عقیدہ تھا وہ ان کی تحریر کے اس ٹکڑے سے عیاں ہو جاتا ہے جو انہوں نے "مائی لائف" میں لکھا۔"

"عقیدت کا اصل سبب یہ جذبہ ہے جو انسانی ضمیر کی آزادی کا حق چاہتا ہے اس کی تعریف یہ ہے کہ جس عقیدہ کی قرآن کریم یا پیغمبر خدا کی تعلیم سے تردید نہ ہوتی ہو اس پر ایمان رکھنا اور اپنے عقیدہ کا برملا اظہار کرنا ہر فرد کا حق ہے یہی ضمیر کی آزادی ہے اور جو مسلمان اس پر ثابت قدم رہے وہی کٹر مسلمان ہے۔ (مائی لائف صفحہ ۲۵۸)

وہ ایک سچے مسلمان تھے۔ پیغمبر اسلام اور ہادی برحق کی محبت کا جذبہ ایک حقیقی جذبے کی صورت ان کے

دل میں موجزن تھا۔ اسی جذبے کے تحت وہ اپنے کلام میں نعت کے اشعار شامل کر دیتے تھے، غزل میں نعتیہ اشعار بھی تغزل کا رنگ اختیار کر لیتے۔

رونمائی کے لیے لایا ہوں جاں — اب تو شاید چہرۂ انور کھلے
جنسِ گراں تو تھی نہیں کوئی مگر یہ جاں — لائے ہیں ہم بھی رونق بازار دیکھ کر
جوہر دسخا ہے ساقی کوثر کی ہوم ہے — ہم کو بھی ایک جام عطا ہو تو جانیے
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں — بھیجی ہیں درودوں کی کچھ میں نے بھی سوغاتیں

اس شعر میں جو یقین و اعتماد کا حسن جھلکتا ہے اس کے رنگ اور لذت کی دلکشی ملاحظہ ہو۔

لے چلے ہیں اس کی رحمت کا یقین
اپنی تو صاحب یہی اوقات ہے

ولادت باسعادت کے موقع پر جو فضا شاعر نے بُنی ہے وہ تمثیل کے لحاظ سے منفرد ہے۔

جب اپنی پوری جوانی پہ آگئی دنیا
تو زندگی کے لیے آخری نظام آیا

مولانا محمد علی جوہر کا یہ شعر ان کے شعور کی پختگی، سیاسی بصیرت اور اسلام سے محبت کا ایک ناقابل فراموش اور زندہ جاوید نمونہ ہے یہی شعر ان کی حب رسول ؐ کی کلید بنتا ہے۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اسی دور کے دوسرے اہم نعت گو شعرا میں عزیز لکھنوی، غریب سہارنپوری، محمد مظفر الدین معلی، امجد حیدرآبادی اکبر میرٹھی، مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد، ممتاز گنگوہی، حافظ جلیل مانکپوری کیف ٹونکی اور دلو رام کوثری شامل ہیں۔

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کئی ہندو شعرا نے نعتیہ کلام کی صورت اظہار عقیدت کیا۔ ایسے شعرا میں دلو رام کوثری، ہری چند اختر، امر چند قیس، عرش ملسیانی تلوک چند محروم، مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد جگن ناتھ آزاد، منور بدایونی، اختر رضوانی، ساحر ہوشیار پوری، گلزار دہلوی، کنور مہندر سنگھ بیدی قابل ذکر ہیں۔

دلو رام کوثری کی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و عقیدت کا یہ عالم تھا کہ بعض متعصب ہندوؤں نے ان کا نام بگاڑ دیا لیکن کوثری کی عقیدت و محبت میں ذرا برابر فرق نہ آیا یہاں تک کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

ان کی یہ رباعی بہت مشہور ہے۔

کیا پہنچا مسیحا جو فلک پر پہنچا — مقصود کو اپنے نہ سکندر پہنچا

اللہ دیکھئی کوثری اتنا چالاک   گنگا سے جو پھسلا لب کوثر پہنچا

کوثری کی ایک نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تھی مجھے عشق محمد جب کہ یہ عالم نہ تھا   بس خلا ہی تھا خلا حوا نہ تھی آدم نہ تھا
چاند سورج آسمان تارے نہ زمیں دریا نہ تھے   گل نہ تھا گلشن نہ تھا اور قطرۂ شبنم نہ تھا
درہم و برہم مرتع تھا جہان ہیچ کا   بادشہ کوئی نہ تھا اور سکہ و درہم نہ تھا
آب و آتش صنعت تحلیل میں محلول تھے   خاک میں یہ خاکساری اور ہوا میں دم نہ تھا
عاشق و معشوق کا راز محبت تھا نہاں   مونس و ہمدم نہ تھا اور آشنا محرم نہ تھا
کوثری اس وقت بھی تھا مجھ کو عشق مصطفیٰ   آج کل جیسا ہے عشق ایسا ہی تھا کچھ کم نہ تھا

یا یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

کوثری تنہا نہیں ہے مصطفیٰ کے ساتھ ہے   جو نبیؐ کے ساتھ ہے وہ کبریا کے ساتھ ہے
لے کے دم دلّو رام کو حضرت گئے جنت میں جب   غل ہوا ہندو بھی محبوبِ خدا کے ساتھ ہے

آغا حشر کاشمیری کا نام ڈرامے کی دنیا میں ایک فصیح محاورے کی صورت میں ہر لب پر ہے۔ لیکن آغا حشر کی شاعرانہ صلاحیتوں نے اس دور میں ڈرامے میں شعری عناصر کو جس حسن و خوبی سے پیش کیا وہ ان کی قادر الکلامی کا ثبوت ہے، آغا حشر کو جس قدر ڈرامے سے شغف تھا اس سے زیادہ اور اس سے پیشتر انہیں دین و مذہب سے والہانہ لگاؤ تھا۔ انہوں نے ابتدا میں کئی دینی مناظروں میں حصہ لیا اور قومی نظمیں لکھ کر اپنی شاعرانہ حیثیت تسلیم کرائی ان کی دو قومی نظمیں شکریہ یورپ اور موج زمزم انجمن حمایت اسلام میں پڑھی گئیں اور علامہ اقبال کی طرح انہیں بھی اسلامیانِ برصغیر کی پسندیدگی اور محبت حاصل ہوئی۔ آغا حشر کا ذوق بہت بلند اور بہت شستہ تھا۔ ان کے ہاں جوش جذبہ، ولولہ درد اور کسک سب کچھ ملتا ہے۔

میں غلام اس کا ہوں جس آقا کا نام پر جلال
دفتر کونین کا سررشتہ آغاز ہے
تو پیام آخری، قرآن کلام آخری
اک تتمہ اور اک شرح کتاب راز ہے
بے بھری دریوزۂ رخ سے ترے کشکول طور
شعلۂ سینا گدائے جلوہ گاہِ ناز ہے

اکبر الہ آبادی کا نام طنز و مزاح کی دنیا میں لاثانی ہے شاید یہی سبب ہے کہ اکبر کی غزل اور نعت کی طرف

توجہ نہیں جاتی، اکبرالہ آبادی نے اپنے دور میں سرسید اور ان کی تحریک کی جو مخالفت کی وہ دراصل وہ مخالفت برائے مخالفت نہ تھی. اکبر کے دل میں اسلام کے لئے جو محبت تھی یہ اسی کا اظہار تھا، وہ قرآنی تعلیمات کے دلی طور پر قائل تھے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں بے حد عقیدت تھی. انہوں نے حضرت سرور کونین ؐ کی سیرت مطہرہ پر ایک مسدس بھی لکھی اور نعتیں بھی مخمس بھی. ایک نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

دلا دے چل ہمیں سوئے محمدؐ — دکھا دے جنت کوئے محمدؐ

شب عاشق میں گیسوئے محمدؐ — خدا کا نور ہے روئے محمدؐ

چمن قرآں ہے ہر لفظ اس کا ہے گل — یہاں ہر گل میں ہے بوئے محمدؐ

مسدس کا ایک بند،

مدیح سرور کونین میں خامہ اٹھاتا ہوں — خیال کفر کی ظلمت پہ اک بجلی گراتا ہوں

شب اوہام ہے شمع یقیں محفل میں لاتا ہوں — چراغ طور ایمن کوہ معنی پر جلاتا ہوں

الٰہی شوخیٔ برق تجلی دہ زبانم را

قبول خاطر موسیٰ نگاہان کن بیانم را

حسرت موہانی رئیس المتغزلین ۔ نعت لکھتے ہیں تو غزل کا حسن اور نزاکت اور عاشقی کے آداب کو یہاں بھی برتتے ہیں. مولانا ایک سچے انسان اور سچے مسلمان تو تھے ہی، سادگی اور فقر ان کا سرمایہ حیات تھا. تین مرتبہ دربار حبیب پر حاضری دی اور رسول ؐ کی محبت کے پھول سمیٹ لائے۔

لے چلی ہے پھر آرزوئے حرم — عاشقان حرم کو سوئے حرم

ملتی جلتی ہے جہاں نوازی میں — بوئے باغ جناں سے بوئے حرم

دیکھ لیتے ہیں صاف اہل نظر — جلوۂ حق کو رو برو ئے حرم

حج بیت اللہ پر ایک خوبصورت مثنوی کہی جس میں سفر کے حالات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبتوں میں لپیٹ کر مکۂ معظمہ میں مکمل کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — حج کو ہوا حکم رسول کریم

راہ نما جب کشش دل ہوئی — سخت جو تھی سہل وہ منزل ہوئی

نعت کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

سلامٌ علیک اے جوار مدینہ — جوار سراپا بہار مدینہ

پسند شوق ہے آب و ہوا مدینہ کی — عجب بہار ہے صل علیٰ مدینے کی

قابو میں نہیں ہے دل شیدائے مدینہ — کب دیکھیے بر آئے تمنائے مدینہ

خوشبوئے رسالت سے ہے ازبسکہ معطر — ہر ذرۂ آبادیِ صحرائے مدینہ

سیماب اکبر آبادی نے بھی اپنی قادر الکلامی کو محض غزل کے لئے استعمال نہ کیا۔ انہوں نے بھی نعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف توجہ دی۔ ان کی یہ نعت اہل دل میں بہت مقبول ہوئی۔

پیام لائی ہے بادِ صبا مدینے سے — کہ رحمتوں کی اٹھی ہے گھٹا مدینے سے

ہمارے سامنے ذیبائشِ بہارِ فصول — بہشت لے کے گئی ہے فضا مدینے سے

نہ آئیں جا کے وہاں سے یہی تمنا ہے — مدینے لائے نہ لائے خدا مدینے سے

جوش ملیح آبادی ہمارے ہاں ایک سب سے بڑی نزاعی شخصیت رہی ہے۔ جوش ملیح آبادی ایک کھرے اور کھردرے پٹھان ہیں وہ سچی باتیں کہتے ہیں اور سچی باتیں تلخ ہوتی ہیں۔ جوش خدا کے بزرگ و برتر پر اسی دن ایمان لے آئے تھے جب انہوں نے کہا تھا۔

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لئے — اگر رسولؐ نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

لادینی کا رجحان ان کی زندگی میں ضرور آیا اور ان سے اہل دل متنفر بھی ہوئے لیکن ان کی زندگی سے مقلومین کربلا، حب رسول مناظرِ فطرت کے لئے محبت کو خارج نہیں کیا جاسکتا۔

الٰہی گدا ہوں مجھے شاہ کر دے — ضمیرِ محمدؐ سے آگاہ کر دے

ان کی نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزم کافری — رعشۂ خوف بن گیا رقص بتانِ آذری

اے کہ ترے بیان میں نغمۂ صلح و آشتی — اے کہ ترے سکوت میں خندۂ بندہ پروری

اے کہ ترا غبارِ راہ تابشِ روئے ماہتاب — اے کہ ترا نشانِ پا نازشِ مہرِ خاوری

تیری پیمبری کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے — بخشا گدائے راہ کو تو نے شکوہِ قیصری

انہوں نے پیغمبر اسلام اور ولادت رسولؐ کے عنوانات کے تحت بڑی زوردار نظمیں لکھیں۔ سورۂ رحمٰن کا ترجمہ ان کی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

حفیظ جالندھری نے شاہنامہ اسلام لکھ کر اسلامی شاعری کی تاریخ میں ایک اہم باب کا اضافہ کیا لیکن شاہنامے کے علاوہ بھی ان کا نعتیہ کلام ان کی انفرادیت کے حسن کا حامل ہے۔

زباں پر اے خوشا صلِ علیٰ یٰسں کا نام آیا — کہ میرے نام جبریل امیں لے کر سلام آیا

محمدؐ جانِ عالم، فخرِ عالم، ھادیِ اکرم — امام الانبیاء، خیر البشر، پیغمبرِ اعظم

حفیظ کی یہ نعت اردو کے نعتیہ ذخیرہ میں ایک ناقابل فراموش اضافہ ہے۔

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب سبحانی   سلام اے فخر موجودات، فخر نوع انسانی

سلام اے ظلِ سبحانی سلام اے نورِ یزدانی   ترا نقش قدم ہے زندگی لوح پیشانی

تری صورت، تری سیرت، ترا نقشہ، ترا جلوہ   تبسم، گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی

مرحوم ماہر القادری بھی ان شعرائے اردو میں سے ہیں جو اپنی زبان نعت کے بیان کے لیے لے کر آئے۔ انہوں نے اپنی حیات میں جو رسالہ جاری کیا اُس کا نام "فاران" بھی اسی عقیدت اور محبت کا اظہار ہے جو انہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی۔ چند اشعار یہ ہیں۔

حسن کی جان، ایماں کی محبت صلی اللہ علیہ وسلم   سرتاپا رحمت ہی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم

فخرِ اُمم، غمخوارِ اُمت، صاحب عظمت حامل قرآں   فرق پہ جن کے تاج شفاعت صلی اللہ علیہ وسلم

قدم قدم پہ ہدایت، روش روش پہ سخاوت   نفس نفس کرم بے شمار کیا کہنا

بس اس خیال سے پاؤں کے طلب نہ سو جائیں   کبھی کبھی خلش نوکِ خار کیا کہنا

بہزاد لکھنوی بھی ان شعرا میں سے تھے جو مدحت رسول ؐ کو ذریعہ نجات سمجھتے تھے۔ ان کا تخیل اور ان کا لحن آمیز ہو کر نعت کی لذت کو خوشبو کی طرح فضا میں بکھیر دیتا ہے۔

جس کی جاں کو تمنا ہے دل کو طلب، وہ سکون بخش محفل مدینے میں ہے

یوں تو جینے کو ہم جی رہے ہیں مگر، جاں مدینے میں ہے دل مدینے میں ہے

کیا مہ و مہر و انجم اور کیا انس و جاں ہے۔ اسی سمت مائل دو جہاں

کوئی سمجھے نہ سمجھے حقیقت ہے یہ، ذرے ذرے کی منزل مدینے میں ہے

ہے تصور میں ہر وقت باب السلام ہیں تصور میں ہر لحظہ وہ سقف و بام

جب سے بہزاد ان کا کرم ہو گیا جاں مدینے میں ہے دل مدینے میں ہے

نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں بیدم وارثی ایک ایسا نام ہے جو ہر زبان پر ہے اور جس کا کلام فضاؤں میں رقص و رنگ کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ بیدم بھی ان شعرا میں سے ہیں جن کی شہرت کا سبب نعت نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

آئی نسیم کوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم   کھینچنے لگا دل سوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کعبہ ہمارا روئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم   مصحف ایماں روئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

قبلہ و کعبہ ایمان رسول عربی ؐ   دو جہاں آپ پہ قربان رسول عربی ؐ

کوئی بہتر ہے نو بہتر سے بھی تو بہتر ہے   سب سے اعلیٰ ہے تری شان رسول عربی ؐ

ترا دیدار ہے دیدارِ الٰہی مجھ کو | تری الفت مرا ایمان رسولِ عربیؐ
احسان دانش شاعرِ مزدور ہیں۔ انہوں نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ قادر الکلامی اور استادانہ انداز ان کا حصہ ہے۔ نعت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم بھی اُن کا محبوب موضوع رہا ہے۔

ہوا جہان میں ذاتِ پاک کا جو ورود | نظر کی حد سے بھی آگے تھے روشنی کے حدود
کہاں سے لاؤں زبان و قلم کے پیمانے | ہے بیکراں تری عظمت مری نظر محدود

ان کی نعت میں تصوف کے نکات کی لذت بھی ملتی ہے ۔

افضل ہے مرسلوں میں رسالت حضورؐ کی | اکمل ہے انبیا میں نبوت حضورؐ کی
کھولے ہیں مشکلات جہاں نے کئی محاذ | کام آئی ہر قدم پہ حمایت حضورؐ کی
اپنا مشاہدہ جو کیا حسنِ ذات نے | تھی آئینے میں سامنے صورت حضورؐ کی

احسان دانش نے بحضورِ رسالت مآبؐ دارینؐ کے عنوان سے جو مسدس لکھا وہ ان کے حوالے سے ایک معرکے کا نعتیہ شہ پارہ بن گیا ہے۔ احسان دانش ہمارے کلاسیکی اور جدید رجحانات کے سنگم کا حسن پیش کرتے ہیں۔ نظم و غزل میں انہوں نے اپنے لیے اردو کی تاریخ میں جو نمایاں ترین مقام حاصل کیا۔ یہ مسدس انہیں اسی طرح نعت کی تاریخ میں بھی ایک اہم مرتبہ دلاتا ہے۔ مسدس میں حضور رسالت مآب کی سیرت لازوال کارناموں، انسانیت پر احسانات اور انقلابی اقدامات کو خراجِ تحسین و عقیدت پیش کیا۔

فرماں روائے قلب و نظر، رحمتِ تمام | مردِ جلیل، خضرِ ملل، داعیِ انام
تو نے خیال و ذہن کو بخشا ہے وہ مقام | تاریخ کی جبیں کے ستارے ترے غلام

تو نے عرب کے زندہ جنازوں کو رم دیا
پامالیوں کو منصبِ گردوں حشم دیا

انسانیت کو تو نے وہ آئین دے دیا | گویا پیام نازشِ تمکین دے دیا
عالم کو ذوقِ جلوۂ تزئین دے دیا | ٹوٹے دلوں کو مژدۂ تسکین دے دیا

گونجی صنم کدوں میں صدا لاالٰہ کی
صورت نکال دی ہے خدا سے نباہ کی

تجھ سے جو رسمِ خدمتِ خلقِ خدا چلی | نشو و نما نے آنکھ اٹھائی ہوا چلی
ویراں چمن کدوں کی طرف خود صبا چلی | کانٹوں میں آج تک بھی وہی ہے چلا چلی

تو نے رواجِ عزم و یقیں عام کر دیا

دھو کر دماغ کفر کو اسلام کر دیا

اس نعت میں حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و شوکت کی مرقع نگاری مضمون و معانی اور فنی بلندیوں کی حامل ہے۔

بصد یقین و بصد اعتبار دیدہ وری
ہے تیری ذات پہ تکمیل عظمت بشری

پناہ دے پھر سہیلؔ اپنا اے رحمت عالم
دلوں میں بے خبری ہے دعا میں بے اثری

اقبال احمد خاں سہیل اعظم گڑھی نے نعت میں عشق و وارفتگی میں ڈوبا ہوا کلام پیش کیا۔ صلی اللہ علیہ وسلم کی ردیف میں مختلف شعراء نے اپنے اپنے انداز میں ہدیہ نعت پیش کیا لیکن اقبال سہیل کی نعت حسن و فن کا عمدہ نمونہ ہے روانی نغمگی، معنویت اور علمیت سب کا امتزاج ان کی نعت گوئی کی انفرادیت ہے۔

احمد مرسل، فخر دو عالم، صلی اللہ علیہ وسلم
مظہر اول، مرسل خاتم صلی اللہ علیہ وسلم

فرد و جماعت، امر و اطاعت کسب و طاعت عفو و شجاعت
حل کئے جو اسرار تھے مبہم صلی اللہ علیہ وسلم

علم لدنی، شان رحیمی، خلق خلیلی، شان کریمی
زہد مسیحا، عفت مریم صلی اللہ علیہ وسلم

ارض و سما میں آیۂ رحمت روز جزا میں سایۂ رحمت
جس کی دعوت اسلم تسلم صلی اللہ علیہ وسلم

قبلہ نمائے سجدہ گذاراں شعلۂ سینا، جلوۂ فاراں
صبح بہاراں جس کا مقدم صلی اللہ علیہ وسلم

اختر شیرانی اردو شاعری میں رومانیت کی تحریک کے بانی ہیں۔ ان کی نعت میں بھی وہی عاشقانہ سے نرماہٹوں اور نزاکتوں کے ساتھ ملتی ہے۔ نعت میں ان کا عجز اور ان کی محبت انہیں نعت کے میدان میں ایک اہم رتبہ عطا کرتی ہے

کس نے پھر چھیڑ دیا قصۂ لیلائے حجاز
دل کے پردوں میں مچلتی ہے تمنائے حجاز

مئے افرنگ میں باقی نہ رہا کوئی سرور
ہم نے جس دن سے چکھی ہے مئے مینائے حجاز

دل دیوانہ دعا مانگ وہ دن پھر آئے
وہی ہم ہوں وہی سجدے وہی صحرائے حجاز

اختر شیرانی کی یہ نعت اہل دل میں بہت مقبول ہوئی اس میں شہر مدینہ کی فضیلت کو آرام گاہ محبوب الٰہی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے سامنے لایا گیا ہے۔ نعت کا انداز غزل کا اور روایتی سہی لیکن اس کی سلاست، نغمگی اور جذبہ اسے دلکشی اور حسن کی دولت سے مالا مال کرتے ہیں۔

ثنائے سجدے نہ کیوں آسماں مدینے میں
رسول پاک کا ہے آستاں مدینے میں

بہشت چیز ہی کیا ہے کہ ایک سجدے میں
یہیں تو مل گئے دونوں جہاں مدینے میں

مدینے جاتے ہیں پیری میں لوگ سب اختر
مزا ہے کاش دو عمر جواں مدینے میں

اخترؔ نے اپنے مخصوص نظم کے انداز میں بھی نعتیں کہیں اور اپنی جدیدیت اور جدت کا شعری ثبوت دیا۔

سودا ہے یہ سر میں

سرکار مدینہ — مختار مدینہ

دیکھوں کبھی جا کر — دربار مدینہ

یثرب کے نظارے — گلزار مدینہ

سرکار مدینہ

بستی ہیں نظر میں

وہ چاندنی راتیں — شاداب کھجوریں

باشرم و حیا سے — سمٹی ہوئی حوریں

زلفوں کو سنوارے — سرشارِ مدینہ

سرکار مدینہ

وحشت ہے نظر میں

اور غم کے اثر سے — روتی ہوئی آنکھیں

حسرت کی فضا میں — کھوئی ہوئی آنکھیں

دل کیوں نہ پکارے — دلدارِ مدینہ

سرکار مدینہ

ان کی اس نعت میں محبت اور عجز فنی حسن اور غنائیت سے ہم آہنگ ہو گئی ہے۔

اگر اے نسیم سحر ترا ہو گذر دیارِ حجاز میں — مری چشم تر کا سلام کہنا حضور بندہ نواز میں

نہ جہاں میں راحت جاں ملی نہ متاعِ امن و اماں ملی — جو دوائے درد نہاں ملی تو ملی بہشت حجاز میں

عجب اک سرور سا چھا گیا مری روح و دل میں سما گیا — ترا نام ناز سے آ گیا مرے لب پہ جب بھی نماز میں

مولانا عبد المجید سالک اپنے دور کے بہت بڑے صحافی، ادیب اور شاعر تھے۔ علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کے ہم عصر اور ان کی صحبتوں کی گرمیاں دیکھ چکے تھے۔ یہ دور وہ تھا کہ انگریز حکمرانوں کے خلاف جدوجہد زوروں پر تھی اس تحریک کو اسلامی جذبہ و جوش نے اور زیادہ پر اثر بنا دیا تھا۔ مولانا سالک بھی اسلامی تحریک جدوجہد کے سپاہی تھے وہ خدا اور اس کے عظیم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر آگے بڑھنے والوں میں سے تھے۔ انہوں نے بھی نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم لکھ کر اپنے قلم کی پاکیزگی اور حرمت کا ثبوت پیش کیا۔

اے شاہ انبیاء و شہنشاہِ کائنات — زینت طرز بوش ہیں تیری تجلیات

اے تیری ذات عقل کا پیرایہ دوام — تیرا عمل ہے مغنی آیات بینات

مولانا ابو الکلام آزاد نثر کے شہنشاہ تھے لیکن نظم میں ان کے قلم کی گوہر افشانیاں اور ان کی عمیق فکر کی جولانیاں اپنا الگ مقام رکھتی ہیں۔ نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے مسلک کا ایک پہلو تھا

موزوں کلام میں جو ثنائے نبیؐ ہوئی — تو ابتدا سے طبع رواں منتہی ہوئی

ہر بیت میں جو وصف پیمبر رقم کیے — کاشانۂ سخن میں بڑی روشنی ہوئی

سالک ہے جو کہ جادۂ عشق رسول کا — جنت کی راہ اس کے لیے ہے کھلی ہوئی

شورش کاشمیری بھی اس جادۂ حسن کے راہی تھے صحافت سیاست اور اسلامیات ان کی روش تھی نادر الکلامی اور حسن کلام ان کا حصہ تھا۔

قلم سے پھول کھلیں نطق دُر فشاں ٹھہرے — وہاں چلا ہوں جہاں گردش زماں ٹھہرے

وہ آستاں کہ ارادت سے مہر و ماہ جھکیں — وہ خاک پاک کہ ہر ذرہ کہکشاں ٹھہرے

کبھی نظیری و فیضی کی خوشہ چینی کی — کبھی نظامی و خسرو کے ہمزباں ٹھہرے

کبھی عراقی و عطار سے نوا مانگی — کبھی ظہوری و قدسی کے رازداں ٹھہرے

نظر جمی کبھی حسان کے قصیدوں پر — کبھی قبیلۂ عشاق کا نشاں ٹھہرے

سید ضیا جعفری کا میدان غزل اور رباعی تھا اور ان دونوں اصناف میں انہوں نے رندی و مستی کا حق بخوبی ادا کیا لیکن فقر و درویشی کی لذتوں نے انہیں دیار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نظاروں اور طواف روضہ کا شرف بخشا ان کا دل عشق نبیؐ کا مواج سمندر تھا ان کی نعت تغزل کا حسن لیے ہے۔

حضور جان بہاراں حضور موج طیور — تمام روح معانی تمام پیکر نور

حضور صبح تجلی حضور عین ظہور — حضور سلسلۂ انبیاء میں نور ہی نور

حضور نور مجسم حضور خلق عظیم — حضور امت عاصی پہ ہیں رؤف و رحیم

نثار عارض گلگوں حدیث لالہ و گل — حکایت لب شیریں وہ کاروان حیات

ہیں آسمان نبوت پہ آپ بدر منیر — حضور آپ کے حلقے میں مہر و ماہ اسیر

جدید تر دور میں اردو میں صنف نعت نے ایک نئی انگڑائی لی ہے۔ شعرا نے اس صنف کی طرف بھرپور توجہ کی ہے اردو شعر کے ابتدائی ادوار میں شعرا حمد و نعت دیوان میں ضرور شامل کرتے تھے لیکن ان میں بعض شعرا نے نعت کی طرف مکمل طور پر توجہ کی، جدید دور میں اردو نعت کی طرف توجہ کا یہ عالم ہے کہ نعتیہ شاعری کے مجموعے بڑی تیزی سے شائع ہو رہے ہیں۔ بعض شعرا نے محسن کاکوروی کے تتبع میں مکمل طور پر نعت ہی کو اپنی شاعری کا موضوع بنالیا ہے۔

خدا اور اس کے برحق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا کی طرف یہ رجحان ہمہ گیر ہے اور نعت کے بہت ہی خوبصورت شہ پارے تخلیق ہوئے ہیں.

جدید دور میں جن شعرا نے نعت کو جذبہ عقیدت اور حسن و فن کا نمونہ بنایا ہے ان میں حافظ مظہر الدین، شورش کاشمیری، رئیس امروہوی، احمد ندیم قاسمی، محشر بدایونی، منور بدایونی، یوسف ظفر، قیوم نظر، صہبا اختر، اقبال صفی پوری، سراج الدین ظفر، جعفر طاہر، طفیل ہوشیارپوری، اعظم چشتی، عبدالکریم ثمر، نعیم صدیقی، مظفر وارثی، عبدالعزیز خالد، قتیل شفائی، حفیظ تائب، شان الحق حقی، فضل حق، حافظ لدھیانوی، سیف زلفی، محشر رسول نگری، شیرافضل جعفری، عاصی کرنالی محسن احسان، عابد نظامی، کوثر نیازی، سید آل رضا، سید ہاشم رضا، عارف عبدالمتین، خواجہ حمید الدین شاہد، سلیم گیلانی، نظیر لدھیانوی، راجا رشید محمود، راسخ عرفانی نمایاں ہیں.

حافظ مظہر الدین کے مجموعہ ہائے نعت شائع ہو تے، وہ روزنامہ کوہستان راولپنڈی سے منسلک رہے اور پہلے پہل اسی روزنامے کے ذریعے ان کی نعتیں اہل دل کے لئے پیغام عشرت لاتی رہیں:

پردے اُٹھے ہوئے نہ تھے حسن ازل عیاں نہ تھا — گنبدِ پاک کی قسم طور پہ یہ سماں نہ تھا

تھا وہ ثنا گرِ حضور، اس کی لحد پہ برسے نور — اہل دول کا مدح خواں مظہرِ خوش بیاں نہ تھا

جہاں بھی تذکرے انوار مصطفیٰ کے چلے — وہیں نجوم و مہ و مہر منہ چھپا کے چلے

اس آستاں پہ بشر کیوں نہ سجدہ ریز آئے — جہاں فرشتۂ رحمت بھی سر جھکا کے چلے

کرنی ہے مجھے مدحتِ سرکار رقم آج — صد شکر مرے قبضے میں ہیں لوح و قلم آج

ہر سانس میں ہے کوچہ محبوب کی خوشبو — معراج محبت کی ہے ایک ایک قدم آج

اک عمر رلایا ہے کڑی دھوپ نے مجھ کو — مل جائے مجھے سایہ دیوار حرم آج

رئیس امروہوی شعر کی ہر صنف پر قادر ہیں، غزل، نظم، قطعہ، رباعی.. نعت کو انھوں نے صنف کے طور پر نہیں بلکہ ایک سلام کے جذبہ ایمانی کے طور پر اپنایا ہے. ان کی نعت میں جذبے کے ساتھ شعریت کا حسن بھی نمایاں ہے.

کس کا جمال ناز ہے جلوہ نما یہ سُو بہ سُو — گوشہ بہ گوشہ، در بدر، قریہ بہ قریہ کُو بہ کو

اشک فشاں ہے کس لئے دیدۂ منتظر مرا — دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم، چشمہ بہ چشمہ جو بہ جو

زلف دراز مصطفیٰ گیسوئے لیل حق نما — طرّہ بہ طرّہ خم بہ خم، حلقہ بہ حلقہ، مو بہ مو

عالم شوق میں رئیس کس کی مجھے تلاش ہے — خطّہ بہ خطّہ، رہ بہ رہ، جادہ بہ جادہ سو بہ سو

احمد ندیم قاسمی جدید دور کا بلا نویس صاحب قلم ہے. افسانہ، مقالہ، ثقافت کالم نگاری، طنز و مزاح دیباچہ نگاری ڈرامہ، غزل، نظم، قطعہ غرض ہر صنف ادب پر حاوی ہے اور اتنی بسیار نویسی کے باوجود ہر صنف میں حسن و معنی اور

معیار فنی بلندیاں چھوتے ہیں اور ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ صنف نعت میں ندیم کے ہاں تازگی اور جدت نمایاں رہی ہے نعت میں بھی ان کی انفرادیت برقرار رہی ہے۔

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا — اس کی دولت ہے فقط نقش کف پا تیرا
لوگ کہتے ہیں کہ سایہ ترے پیکر کا نہ تھا — میں تو کہتا ہوں جہاں بھر پہ ہے سایہ تیرا
پورے قد سے میں کھڑا ہوں تو یہ ہے تیرا کرم — مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا
ایک بار اور بھی یثرب سے فلسطین میں آ — راستہ دیکھتی ہے مسجد اقصےٰ تیرا

میری پہچان ہے سیرت ان کی — میرا ایماں ہے محبت ان کی
پتھروں میں بھی لہو دوڑ گیا — اس قدر عام تھی رحمت ان کی
فتح مکہ مرے دعوے کی دلیل — عدل کی جان عدالت ان کی
ارتقا اس سے اجازت مانگے — ان کی ہو جائے جو اُمت ان کی
وقت اور فاصلہ برحق لیکن — میرا فن کرتا ہے بیعت ان کی
میرا معیار غزل خوانی ہے — حرف سادہ میں بلاغت ان کی
نعت میری یہ اشارہ اُن کا — پھول میرے ہیں تو نکہت ان کی

دنیا ہے ایک دشت تو گلزار آپ ہیں — اس تیرگی میں مطلع انوار آپ ہیں
یہ بھی ہے سچ کہ آپ کی گفتار ہے جمیل — یہ بھی ہے حق کہ صاحب کردار آپ ہیں

محشر رسول نگری ایک باعمل صوفی منش بزرگ ہیں۔ علامہ اقبال سے بہت متاثر ہیں اور ان کے رنگ کو اپنانے کی کوشش بھی کی ہے۔ ان کے کلام میں سلاست کے ساتھ رنگینی اور تاثیر بدرجہ اتم ملتی ہے کلام میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔

ہیں کون و مکاں گوشۂ دامان محمدؐ — ہر چیز ہے شرمندۂ احسان محمدؐ
کس چیز کی دربارِ نبوت میں کمی ہے — افسوس ہم ہی نہیں شایان محمدؐ

تری دید نزول ہے قرآں کا — ترا مکھڑا علیٰ کتاب ہے جی
تیرے چاہنے والے ہیں کتنے جیوں — ترا عشق بھی حسن مآب ہے جی
تری نعت ہے نغمہ سازِ ازل — تیری یاد ہی کار ثواب ہے جی
ہے سرود الست وظیفہ مرا — رگ جاں نہیں تار رباب ہے جی

عبدالعزیز خالد ایک پرگو شاعر ہے۔ اس کا مطالعہ وسیع اور اس کی سوچ عمیق ہے، نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف

پوری توجہ دی ہے اور اپنی علمیت کا اس صنف میں صحیح اور بجا اظہار کیا ہے ان کا کلام علمیت کے سبب مشکل پسندی اور عربی الفاظ سے بھرا ہے عام قاری اس سے مستفید ہونے سے محروم رہ جاتے ہیں، فارقلیط، منحمنا، حمطایا، ماذ ماذاں کے نعتیہ کلام کے مجموعے ہیں۔

روئے زمیں پہ پرتو نورِ خدا ہے تو — قدموں پہ چلنے والوں میں سب سے بڑا ہے تو

اقلیم ذوق و شوق ہے زیر نگیں ترے — ملکِ نیاز و ناز کا فرماں روا ہے تو

میرا مم، امام رسل، ہادی سبل — شاہِ دو کون و سر در ہر دو سرا ہے تو

بر د مبتر د مکتف و کان وفا و صدق و صدق — پیکِ جمال و پیکر عہد وفا ہے تو

مطاع آدم و اہم، متاع لوح و قلم — محمدؐ امتی محبوب کبریا صلعم

محمدؐ انجمن کن فکاں کا صدر نشین — محمدؐ افسر آفاق و سرور عالم

حمود و حامد و احمد محمد و محمود — کریم و غیر کرام، مکرّم و اکرام

وہ لایموت سراج سُبل امام رسل — امیر قافلہ سخت کوشِ اہل ہمم

جدید دور کے شعرا میں تنویل شفائی نے بھی نعت رسولؐ میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے خوبصورت کلام تخلیق کیا۔ اس کے ہاں وہی نغمگی، کھنک، روانی، حسن الفاظ اور رنگینی خیال پائی جاتی ہے

اشک سے کیوں نہ تکے رفعت افلاک مجھے — لوگ کہتے ہیں غلام شہ لولاک مجھے

وہ مقدر کا دھنی ہوں کہ دُعا سے پہلے — بخش دی اس نے شہنشاہی ادراک مجھے

لب کشائی کی بھلا مجھ میں کہاں تھی جرأت — کر دیا اس کی عنایات نے بیباک مجھے

میرے ہر آئینہ اشک میں ہے عکس نبیؐ — پیار پھر کیوں نہ کرے دیدۂ نمناک مجھے

یوسف ظفر مرحوم کی آخری عمر وقفِ ذکر رسالت ہو گئی تھی۔ وہ عملی طور پر عشق رسولؐ اور تصوف کی دنیا کے ہو کر رہ گئے۔ یوسف ظفر فنِ شعر کے حسن اور جدیدیت کی فنی وسعت کے ترجمان رہے ہیں۔ یہ تنظیمیں ان کے مطالعے اور قادر الکلامی کی دلیل ہے۔

نہ جمال تابِ جمال ہی — نہ زبانِ حرفِ سوال ہی

مری جاں ہے ترے نور سے — مری کائنات ترا خیال ہے

بلغ العلیٰ بکمالہ — کشف الدجیٰ بجمالہ

تری شان کیسے کروں بیاں — کہ زبان و حرف ہیں بے زبان

یہ کرم کہ تو ہے درونِ دل — یہ شرف کہ تو ہے رہین جان

کہ پہنچ سکے ترے حسن تک نہ گمان ہے نہ خیال ہے

حسنت جمیع خصالہٖ — صلّوا علیہ و آلہٖ

جعفر طاہر ایک مست و مجذوب شاعر تھے، غزل، نظم نعت و نثر سبھی میں اس کا ایک منفرد انداز تھا اس کے اشعار میں اس کی مستانہ اداؤں کی طرح مستی، بے باکی، بے ریائی، ترنم نغمگی، روانی، تلاش الفاظ و حسن بیان سلیقے سے ملتا ہے سلسبیل میں جعفر طاہر نے حمد و منقبت و مرثیہ و سلام و مدح کا حق ادا کیا ہے۔ کتاب کی پہلی بہاریہ نظم میں ساقی نامے کی لذت اور قصیدے کی شان پائی جاتی ہے۔

والا نسب، والا حشم — محمدؐ ہے عرب، صنم عجم
خیر البشر، خیر الامم — محبوب رب ذوالمنن
فرخندہ رو، فرخ سیر — انجم قبا، عالی نظر
ہر پاک سے پاکیزہ تر — کوثر زباں، زمزم دہن
ہیں آپ ختم المرسلین — ہیں رحمت اللعالمین
اللہ یہ حبل المتین — ٹوٹے غلامی کے رسن
طٰہٰ لقب یٰسیں نوا — ہیں شہر یار ہل اتیٰ
ہیں مصطفیٰ او مجتبیٰ — باطل نگن لشکر شکن
لوح و قلم کی اصل ہیں — میزانِ عشق و عدل ہیں
معیارِ علم و عقل ہیں — نقدِ ہنر مقصودِ فن

یا یہ نعت اپنے منفرد رنگ و آہنگ کی حامل ہے۔

اے سرور لولاک لما سید و سرتاج — یہ کرسیٔ قوسین مبارک ہو تجھے آج
اے صلِ علیٰ کون و مکاں پر یہ ترا راج — اے صاحب معراج
کیا صورت در ہے، طاقت کے طنطنے — یہ قیصر و کسریٰ ہے ہیں ترے سامنے کیا شے
دیتے ہیں ترے در کے گداؤں کو [illegible] — اے صاحب معراج
اس بندۂ ناچیز پہ رحمت کی نظر ہو — میں نعت کہوں مجھ کو عطا علم و ہنر ہو
اک شاعر بدنام نہ عالم ہوں نہ الحاج — اے صاحب معراج

نعت رسولؐ کے باغ دلکشا میں چہکنے والوں میں شاہ عبدالغنی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شاہ عبدالغنی ان شعرا میں سے ہیں جن کو باعمل صوفی کہا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحب نے وحدت الوجود کو اپنی شاعری کا محور بنایا ہے اس طریقت کے

شعر آیں خواجہ میر درد، حضرت شاہ نیاز بریلوی، اصغر گونڈوی، امجد حیدر آبادی اور علامہ اقبال کو بڑی اہمیت حاصل ہے
شاہ صاحب کے نزدیک عارفانہ کلام سے اعلیٰ کردار کی تعمیر اور کار خیر کی ترغیب ہوتی ہے۔ یہ اس طریقت کے
حلقہ بگوش عموماً نعت گو شعراء پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان کا سینہ ایمان اور خود اعتمادی کی قوت سے بھرا ہوتا ہے ایسا کلام،
زندگی کو پختگی بخشتا ہے اور روح کو بالیدگی اور بلندی عطا فرماتا ہے۔ وہ انفس و آفاق کی بوقلمونیوں اور خدا کی صفات
ربوبیت کی یاد دلاتا ہے۔ نغمات عشق کے عنوان سے ایک ضخیم مجموعہ حمد و نعت کے علاوہ بھی ان کے کئی مجموعے،
شائع ہو چکے ہیں۔

مرحبا آمدِ خاتم الانبیاءؑ نظم عالم سراسر بدلنے لگا۔
بجلیاں رحمتوں کی چمکنے لگیں نور کا مینہ رم جھم بدلنے لگا

رحمتوں کی گھٹا اٹھی فاران سے ایسی برسی کہ صحرا چمن بن گئے
خشک سوتے سوتے زندہ ایماں کے قطرہ قطرہ انا البحر بہنے لگا

یہ ساری نعت حسن مطلع کی رنگینیاں لئے ہے —

ذرہ بھی آفتاب ہے خاک حجاز کا | یعنی ہے چشمہ نورِ حقیقت طراز کا
احسان ہو گا ساقی وحدت نواز کا | ساغر عطا ہو بادۂ ہستی گداز کا
چمکا جو مہر، احمد وحدت طراز کا | ٹوٹا طلسم شبنم کثرت نواز کا
ہے رند مست پیر مغانِ حجاز کا | پوچھو غنی سے لطف حقیقی نماز کا

سیف زلفی کا مجموعہ نعت روشنی جدید انداز کے نعتیہ کلام کی روشنی بخشتا ہے۔ یہ مجموعہ سیف کی ذہانت، عشق رسول اور
جدیدیت اس کے ہر شعر سے مترشح ہے۔

سیف زلفی از مدینہ تا بخاک کربلا — مجھ کو دکھلائی ہے میرے رہنما نے روشنی
لاہور کی زمیں سے زلفی بفیضِ عشق | میں روز دیکھتا ہوں مدینہ رسول کا

نعت لکھنے کا مخلصانہ شوق ان اشعار سے چھلک پڑتا ہے۔

توصیف تری، خامۂ جدت سے لکھوں گا | میں تیرا سراپا نئی صورت سے لکھوں گا
تو لوح و قلم ہے تری مدحت کا صحیفہ | فرصت میں قلمدانِ ارادت سے لکھوں گا
حسانؓ بنا دے مجھے، میں تیرا قصیدہ | قرآن کے لہجے میں بلاغت سے لکھوں گا
اجلا ہے فرشتوں سے ترے نور کا پیکر | اس منظر مہتاب کو حیرت سے لکھوں گا

حفیظ تائب اور حافظ لدھیانوی نے اپنی شاعری کو صرف ثنائے خواجہ کے لئے وقف کر دیا ہے وہ اس

صنف میں نئے نئے امکانات کی تخلیق میں کوشاں رہتے ہیں حفیظ تائب پنجابی زبان کے استاد ہیں اور پنجابی میں بھی انہوں نے نعت کو اپنے بیان کے لئے منتخب کیا ہے، ان کے اردو اور پنجابی نعت کے دو مجموعے "صلو علیہ وآلہ" اور "سک متراں دی" شائع ہو چکے ہیں۔ ان مجموعوں نے اُردو اور پنجابی زبانوں میں ایک نئی منفرد آواز کو متعارف کرایا ہے، وہ سبز گنبد کی زیارت سے بھی مشرف ہو چکے ہیں اور دل میں درد و سوز اور محبت و عقیدت کا نور رکھتے ہیں اب تو گویا نعت ہی حفیظ تائب کی پہچان بن گئی ہے۔

نعت حضرت مری پہچان ہے سبحان اللہ
یہی دنیا، یہی ایمان ہے سبحان اللہ

یہ اشعار بھی ان کی نعت گوئی کے شعور کی پہچان ہیں

مدح نبی وہ چشمۂ نور و حضور ہے
جس سے ہیں تابناک مرے خد و خالِ فن

شیرازہ حیات ہے وابستہ حضور
پروردۂ نگاہِ کرم اعتدالِ فن

جذبے، چاہت اور وارفتگی کے علاوہ ان کی نعت فنی لحاظ سے بھی حسن و تکمیل کا نمونہ ہے۔

دلوں کی تہہ میں پوشیدہ محبت دیکھنے والا
وہ محبوب خدا جذبوں کی وسعت دیکھنے والا

وہی ہے سننے والا ان کہے الفاظ چاہت کے
وہی ہے ان لکھے حرفِ ارادت دیکھنے والا

ہوا ہے کون جز مولائے سلمان و بلال اب تک
بجائے حسنِ صورت تو سیرت دیکھنے والا

شبستانِ حرا کیونکر نہ بنتا مرکزِ عرفاں
کہ ہے پہلے پہل نور نبوت دیکھنے والا

حافظ لدھیانوی غزل کا شاعر تھا۔ لیکن زیارت رسول اور عشق نبی نے حافظ کی غزل کو نعت کا جامہ پہنا دیا، اور اب وہ غزل کے سارے تلازمے نعت میں لے آیا ہے "تمنائے خواجہ، حافظ لدھیانوی کی نعتوں کا مجموعہ ہے جو اس کی شگفتہ بیانی کا بولتا ہوا ثبوت ہے۔

جب سے جمال سید عالم نظر میں ہے
اک سرمدی سرور دل نغمہ گر میں ہے۔

طیبہ کی راہ میں ہیں زمانے کی راحتیں
آسودگی قلب و نظر اس سفر میں ہے

گذرا ہے جو حبیب خدا کے دیار میں
حافظ وہ رحمتوں کا زمانہ نظر میں ہے

تجھ سے منور ہو گئے فکر و نظر کے بام و در
ہر لحظہ ہر اک آن ہے شام و سحر میں جلوہ گر

تیرا جمال دلنشین
اے رحمۃ للعالمین

سرکار کی مدحت ہو موضوع سخن میرا
تفسیر دل و جاں ہو آئینہ فن میرا

اس نام گرامی سے شاداب و درخشاں ہے
یہ جانِ حزیں میری یہ حجلۂ تن میرا

سلیم گیلانی ۔ ٹھمریوں، دادروں، گیتوں اور غزلوں کا شاعر، ہولیوں اور بیجانوں میں کھلنے والے پھولوں کا ذکر کرتے

کرتے اچانک اس راستے پر آ گئے ہیں. جو نور کا راستہ ہے نجات کا راستہ ہے.

ذکرِ اطہر سے ہوئی موجِ ہوا عطر آگیں — غنچۂ فکر کھلا، نطق ہوا عطر آگیں

اُن کی رحمت سے مرے صبح و مسا عطر آگیں — جن کی بعثت سے ہوئے ارض و سما عطر آگیں

گلشنِ خلد کا ٹکڑا ہے مدینے کی زمیں — جس کے ذرّوں سے ہوئی جھونکے صبا عطر آگیں

جلیل عالی اور ریاض حسین چودھری نے نعت میں اظہار و ہیئت کے جدید پیمانے استعمال کئے.

شبنم رومانی نے بھی اپنے مخصوص انداز سے نعت کی وادیوں میں گلگشت کی لذت حاصل کی.

وِرد کرتا ہوں میں صبح شام آپ کا — واقعی اسمِ اعظم ہے نام آپ کا

کر گئے بادشاہی غلام آپ کے — بادشاہوں کو دیکھا غلام آپ کا

آپ احمد بھی ہیں اور محمد بھی ہیں — حمد ہے لازمی جزوِ نام آپ کا

عدل سے بھی ہوا منصفی آپ کی — انتہائے کرم انتقام آپ کا

راسخ عرفانی نے بھی نعت کو وردِ حیات بنالیا ہے ان کے نعت کے چند مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ارمغان حرم، غبارِ حجاز اور حسن کلام کو خصوصیت حاصل ہے. راسخ نے ورثے میں دولت حُبِ رسول پائی، ان کے والد بھی ایک متقی اور متشرع عالم دین تھے. ان کے کلام میں عشق رسول کا رنگ گہرا ہے.

مجھ پہ برس رہی ہے مدینے کی چاندنی — سایہ مرا ہے آج مرے سر سے بھی بلند

گذر کے آتی ہے بادِ سحر مدینے سے — سنور رہا ہے تصور بڑے قرینے سے

درِ حضور پہ پہنچوں تو اُن کی نذر کردوں — چمک رہے ہیں جو پلکوں پہ آبگینے سے

ہونٹوں پہ تذکرہ ہے رسالت مآب کا — ہر سانس ہم نفس ہے شمیم گلاب کا

پتھر بھی موم کر دیتے زورِ کلام سے — کس درجہ یہ کمال ہے ام الکتاب کا

سایہ کیا تھا دھوپ میں جس نے حضور پر — کتنا وہ خوش نصیب تھا ٹکڑا سحاب کا

مظفر وارثی کے سوزِ سخن و حسن کلام کی آمیزش نے اس کے بیان میں تاثیر پیدا کر دی ہے، مظفر وارثی نے خوبصورت نعتیں لکھی ہیں. جو اکثر نشری ذرائع سے فضاؤں میں گونجتی رہتی ہیں یہ نعت خصوصی طور پر ایک شاہپارے کی حیثیت رکھتی ہے

الہام جامہ ہے ترا — قرآں عمامہ ہے ترا

منبر ترا عرش بریں — یا رحمت للعالمین

دوسری نعت کا ایک بند.

سلام تم پہ درود تم پر

تمہاری آہٹ سے ذہن جاگے | نگاہ جاگے نہ تم سے آگے
بس ختم ساری حدود تم پر | سلام تم پر درود تم پہ
تمہارا جلوہ خمیر آدم | تم آسمان و زمیں کے سنگم
تمہاری آمد کمال ایزد | تمہارے اندر تمام عالم
تمہاری ممنون ہر گھڑی ہے | ابد کو گھیرے ہوتے کھڑی ہے
عمارت ہست و بود تم پر | سلام تم پر درود تم پر

اعظم چشتی بھی نہ صرف نعت گو بلکہ خوش الحان نعت خواں ہیں۔ وہ بھی ان اہل دل میں سے ہیں جن کا دل عشقِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منور ہے۔ اعظم چشتی کی نعتوں کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

سمجھا نہیں ہنوز مرا عشق بے ثبات | تو کائنات حسن ہے یا حسنِ کائنات
جو ذکر زندگی کے فسانے کی جان ہے | وہ تیرا ذکر پاک ہے اے زینتِ حیات
اک خالقِ جہاں ہے تو اک مالک جہاں | اک جانِ کائنات ہے اک وجہ کائنات
اب تک سجی ہوتی ہے ستاروں کی انجمن | اس انتظار میں کہ پھر آئیں وہ ایک رات

عاصی کرنالی بھی گو اور خوش گو نعت گو ہیں۔ نعت نبیؐ مکرم کا اچھا خاصہ ذخیرہ ہے۔ درد و تمنا ان کی نعت کی خصوصیت ہے۔

ہجوم عاشقاں ہے مدحت سرکار ہو جائے | بھری محفل میں اپنے عجز کا اقرار ہو جائے
مدینے کی ہوا گر کھینچ لے دامانِ نازا پنا | یقیناً سانس لینا بھی ہمیں دشوار ہو جائے
تجھے دیکھوں تو عمر خضر لے کر تجھے دیکھوں | تجھے چاہوں تو اپنی زندگی سے پیار ہو جائے

صہبا اختر ایک بلند آہنگ شاعر ہیں، پر گو، تلاش ان کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ وہ طویل نظم لکھتے ہیں لیکن، حسنِ شعر مدنظر رہتا ہے۔ نعت نبی کی طرف مائل ہوئے اور بھرپور شاعری کی۔ اقرأ ان کی نعتیہ شاعری کا مجموعہ ہے۔ ان کی نعت بھی لفظ و معنی پر قادر الکلامی کے ساتھ جوش وجذبے کا حسن لئے ہوئے ہے۔

افضل و اعلیٰ، برتر و بالا، نادر و یکتا، کامل و اکرام
ماہ معلیٰ، مہر مجلیٰ، حسن سراپا، نور مجسم
خاک مدینہ تجھ سے منور، عظمت کعبہ تجھ سے معظم
سایہ برکت، آیہ رحمت، ابر سخاوت، موجِ مکرم
اک جیسے ہیں چاہے کچھ ہو، تیرے کرم کے سارے موسم
صلی اللہ علیہ وسلم، صلی اللہ علیہ وسلم

یا یہ نعت

مصطفیٰ وہ نام ہے جس نام کی حد کچھ نہیں

قلزم آب رواں، کہسار منجمد کچھ نہیں

خاکِ لالہ رنگ و آفاقِ زبرجد کچھ نہیں

صبح ہاتے روشن و شب ہائے اسود کچھ نہیں

جز محمدؐ کچھ نہیں

جدید شعرا میں امجد اسلام امجد، عطاالحق قاسمی یشفتر قریشی، حسن اختر جلیل، حلیم قریشی سرحد میں رضا ہمدانی فارغ بخاری عزیز اختر وارثی، ایوب صابر، مسعود انور شفقی، یوسف رجا چشتی، پیر اکرم، شوکت واسطی، ڈاکٹر اختر جعفری، غلام احمد شا جلیل حشمی اہمیت رکھتے ہیں انہوں نے گلشن نعت میں رنگ رنگ کے پھول کھلائے ہیں۔ محسن احسان نے بہت جدید انداز اپنائے ہیں، محسن احسان کی آزاد نظم " انا مدینۃ العلم وعلی بابہا "حسن معنی اور عقیدت وانکساری کا حسین نمونہ ہے۔" آپ تو شہر علم ہیں مولا اور اس شہر کا دروازہ اک ایسی ذات گرامی ہے جو اپنی جگہ پر ایک حصار علم و ہنر ہے دروازے تک پہنچ نہ پاؤں شہر کے اندر کیسے جاؤں۔ میں اندھا ہوں میں بہرہ ہوں میں گونگا ہوں میں جو دیکھنا چاہوں بھی تو کچھ نہ دکھائی دے میں جو سننا چاہوں بھی تو کچھ نہ سنائی دے، میں جو بولنا چاہوں بھی تو میرے گونگے لفظ لبوں پر سانس نہ لینے پائیں اپنے عہد کے چاروں سمت میں دیکھوں مجھ کو لفظ دکھائی دیں۔ لفظوں کا بیوپار لگا ہے کاغذ کا انبار لگا ہے خالی نقطوں، کھوکھلے حرفوں کا بازار لگا ہے آپ تو شہر علم ہیں مولا میرے بانجھ خیالوں گونگے لفظوں، بے رس نقطوں کی توقیر بڑھا دے۔

اس شہر علم کی توصیف کس سے ممکن ہے۔ شہر علم کو جس قدر نذرانہ عقیدت پیش کیا جائے، وہ کم ہے، سمندر کو قطرے کا پیش کش حقیر۔ لیکن قطرے کی عقیدت اپنی جگہ،

نعت رسول کے باب میں اردو شعرا نے ہر دور میں اپنی محبت اور عقیدت کے نذرانے پیش کیے ہیں مدحت ایک جذبہ ہے لیکن اس جذبے کے گرد جب تانا بانا بُنا گیا ہے۔ اس کے ان گنت رنگ، اس کا حسن، اس کا انداز بوقلمونی کا حامل ہے۔ مدحت کی رنگا رنگی اور تازگی برقرار ہے۔ وہ ذات گرامی ایسی ہے کہ مدح کے گلاب کھلتے رہیں ان کی خوشبو کبھی پرانی نہیں ہوتی، کبھی باسی نہیں ہوتی، کبھی اپنی قوت نہیں کھوتی، سلسلہ نعت جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔

اردو منقبت نگاری

ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری

اسلامی قدروں کو اُجاگر کرنے اور اسلام کی اولوالعزم شخصیتوں کی زندگیوں اور کارناموں کو جلا بخشنے کے لئے ہماری اردو شاعری جو فارسی کی گود میں پل کر جوان ہوئی ہمیشہ پیش پیش رہی ہے ہر دور میں ملی بنیادوں کو مستحکم رکھنے والے اور انسانیت نواز قدروں کی طرف دعوت دینے والے شاعر اور ادیب موجود رہے ہیں۔ ان شعرا نے کلام مجید کے منظوم ترجمے نعتیں منقبتیں، مرثیے نوحے اور سلام وغیرہ بے شمار اصناف میں اسلام کی عظمت اور بلند معانی بیان کئے ہیں جن کو حسن کر اہل دل اور اہل نظر نے عرفان حاصل کیا خاص طور پر منقبت میں بزرگان دین سے والہانہ عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔

منقبت کے لغوی معنی تعریف، توصیف، ثنا اور صفت کے ہیں۔ لیکن اساتذہ فن نے اس نظم کو منقبت ٹھہرایا جس میں اہل بیت اطہار، اصحاب رسول، اولیائے کرام اور بزرگان دین کی مداح کی گئی ہو اور خاص طور پر مولائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالب علیہ کی تعریف و توصیف میں لکھی گئی ہو۔

چونکہ یہ بے حد طویل موضوع ہے اور ایک مختصر سے مقالے میں تمام بزرگان دین کے مناقب کا احاطہ کرنا ممکن نہیں اس لئے زیادہ تفصیل میں نہیں جاسکتا۔ اور صرف ان منقبت نگاروں کے ذکر پر اکتفا کروں گا جنہوں نے مولائے کائنات حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کے حضور مناقب کے ہدیے پیش کئے ہیں۔ اور ان میں بھی ان مشہور شخصیتوں کا ذکر کروں گا جن کا اس میدان میں منفرد مقام تھا۔

منقبت کے لئے کوئی خاص ہیت متعین نہیں ہر شاعر نے اپنے احساسات کا اظہار اور نذرانہ عقیدت اپنی بساط کے مطابق اپنی پسندیدہ صنف نظم میں پیش کیا ہے۔ کسی نے قصیدے کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا تو کسی نے مثنوی کو۔ کسی شاعر نے اپنے اظہار خیال کے لئے نظم کو منتخب کیا تو کسی نے رباعی کو۔ بہر حال اردو ادب کا دامن کئی معرکتہ آلارا منقبتوں سے بھرا پڑا ہے۔

دکنی دور کے پہلے شاعر سے لے کر آج تک سینکڑوں شاعروں نے منقبتیں لکھیں اور اہلبیت کرام صحابہ عظام اور خاص طور پر مولائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالب اور دیگر بزرگان دین کے حضور عقیدت کے نذرانے پیش کئے ہیں۔

دکنی دور میں چونکہ بیجاپور اور گولکنڈہ ریاستوں کے سربراہوں کا رجحان زیادہ تر مذہب کی جانب تھا اس لئے اپنے درباری شعرا کو قصیدہ اور دیگر عشقیہ نظموں کی بجائے حمد نعت۔ منقبت۔ مرثیہ اور اسلام لکھنے کی طرف راغب کیا یہی وجہ ہے کہ دکنی دور کے اردو ادب کا دامن مذہبی شاعری کے شہپاروں سے مالامال ہے۔

شمالی ہند میں خاص طور پر میر و سودا کے زمانے میں جسکو اردو شاعری کا عہد زریں کہتے ہیں مدح و ستائش اہل دول

کے ساتھ ساتھ حمد، نعت اور منقبتیں بھی لکھی گئیں اور اس میدان میں مرزا محمد رفیع سودا پیش پیش ہیں۔ سودا کے دیوان میں کل اکتالیس قصیدے موجود ہیں اور ان میں سے کئی قصیدوں کا موضوع نعت اور منقبت ہے۔

سودا کی مضمون آفرینی، بلند فکری اور بلند آہنگی اور مبالغہ آرائی حسن بیان زور کلام اور شوکت و متانت کے ساتھ ان کے قصیدوں میں جلوہ گر ہے اس سے ان کی مختلف اسالیب بیان پر قدرت کا ثبوت ملتا ہے۔ اور اس کے سبب ان کے عقیدوں میں نزاکت اور معنویت کی مثالیں ملتی ہیں جن کی تاریخ ادب میں کسی اور شاعر کے ہاں نظیر نہیں ملتی منقبت میں جو قصیدے تحریر کئے ہیں ان میں عظمت و بزرگی۔ شرافت و نجابت، علم و حیا، فیوضات و برکات اور کشف و کرامات وغیرہ کا ذکر ہے۔ ایک قصیدے کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں جس میں سودا کی امیرالمومنین اسداللہ الغالب حضرت علی ابن ابی طالب سے عقیدت کا ثبوت ملتا ہے۔

شیر یزداں شہ مردان علی عالی قدر — وصی ختم رسل اور امام اوّل
دید ترا بید لی حق سے نگہ کا ہے خلل — ایک شے دو نظر آتی ہیں بچشم احول
تری قدرت بجہاں قدرت حق کی خاطر — خلق کے وہم کا رغلط میں ٹھہرے ہے مثل
مرضی حق تری مرضی سے ہے جوں جوہر و فرد — اس یقین میں نہ گماں کر سکے زنہار خلل
علم تیرا نہیں کچھ علم خدا سے باہر — ہے علم بھی وہی ترا جو خدا کا ہے عمل
رائے تیری کے موافق جو نہ لکھے نسخہ — کرے تاثیر نہ عیسیٰ کا مداوا کسل
سر کے پیکان نہ قبضہ سے کمال کے سو مو — ہو اشارہ جو ترا تیز قضا کو کہ نہ چل
تک تری مرضی کے باہر جو کرے کا جہاں — ہاتھ سے کام نہ مائے کا وہیں جائے بچل

اس کے علاوہ بھی سودا کے کئی قصیدے ہیں جن میں بزرگان سلف کی مدح کی گئی ہے اور ان کے حضور گلہائے عقیدت پیش کئے گئے ہیں۔

ہمارے قدیم مثنوی نگاروں کے ہاں یہ خوبصورت روایت ملتی ہے کہ اصل مثنوی کی کہانی شروع کرنے سے پہلے مثنوی کا آغاز حمد، نعت منقبت سے کیا جاتا تھا۔ اور مثنوی نگاروں میں جو بلند مقام سحرالبیان کے خالق میر حسن کو حاصل ہے وہ آج تک کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔ ان کے ہاں زبان کی چاشنی۔ محاوروں کی بندش۔ الفاظ کا برمحل استعمال اور اشعار میں روانی اور برجستگی کا عنصر اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ ہے مثنوی سحرالبیان میں طرز ادا کا حسن ہے عبارت صاف پاکیزہ اور بامحاورہ ہے۔ بیان سراسر شوخ اور دلپذیر ہے شیرینی ترنم کی کمی نہیں۔ ہر لفظ اپنی جگہ پر نہایت موزوں۔ کہیں نام کو کرختگی اور بدنمائی نہیں۔ گفتگو اور مکالمے کے نفیس ترین پھول کھلتے نظر آتے ہیں۔ اظہار خیال پر اتنی قدرت حاصل ہے۔ کہ کوئی رکاوٹ یا دقت محسوس نہیں ہوتی۔

میر حسن نے بھی مثنوی روایت کے پیش نظر ابتدا میں کہانی کے آغاز سے پہلے حمد و نعت اکے الگ الگ باب قائم کئے ہیں ان کی منقبت کے چند شعر ملاحظہ کریں۔

ہوئی جو نبوت نبی پر تمام — ہوئی نعمت اس کے وصی پر تمام
جہاں فیض سے انکے ہے کامیاب — نبی آفتاب اور علی ماہتاب
علی دین و دنیا کا سردار ہے — کہ مختار کے گھر کا مختار ہے
دیار امامت کے گلشن کا گل — بہار ولایت کا باغ سبل
علی راز دار خدا و نبیؐ — خبر دار سر خفی و جلی
علی بندۂ خاص درگاہ حق — علی سالک راہبر راہ حق
علی ولی ابن عم رسول — لقب شاہ مردان و زوج بتول
خدا نفس پیغمبرش خوانده است — دگر را فضیلت کجا مانده است
علی کا عدو دوزخی دوزخی — علی کا محب جنتی جنتی
ہوئی آن پہ دو جگ کی خوبی تمام — انہوں پر درود و انہوں پر سلام

میر انشاءاللہ خاں انشاء جیسا عالم زبان داں اردو شعراء میں کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ انہوں نے عربی فارسی اُردو پشتو، پنجابی اور پوربی سب زبانوں میں شعر کہے ہیں ان کو جامعیت کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں میں خاص امتیاز حاصل ہے محمد حسین آزاد نے ان کے بارے میں بہت صحیح کہا ہے "کہ ان کے علم و فضل کو شاعری نے اور ان کی شاعری کو نواب سعادت علی خاں کی مصاحبی نے ڈبو دیا"

انشاء نے اپنے قصیدوں میں سنگلاخ زمینیں بھی اختیار کی ہیں۔ اس کے باوجود ان کے قصائد استادی کے لحاظ سے مکمل ہیں۔ ایک قصیدہ انہوں نے صنعت غیر منقوط میں بھی لکھا ہے۔ ان کے قصیدوں میں روانی برجستگی اور روزمرہ کا استعمال قابل تعریف ہے۔

مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کی ذات گرامی سے ان کو والہانہ عشق تھا۔ اور اس بات کا ثبوت اِن کے اُن قصیدوں سے ملتا ہے جو انہوں نے مولائے کائنات کی مدح میں لکھے ہیں ایک قصیدے کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

یا علی جبکہ زباں سے کہے انشاءاللہ — کرہ نار میں سب بجھ گئے بھباق آتش
طائر سدرہ سے میں گرم بحث ہوں جس جا — کب کرے مثل کلاغ آ کے وہاں غاق آتش
آنچ دوزخ کی نہ پھٹکے مرے دامن کے قریب — گرچہ ہے واں کی غضب شدہ آفاق آتش
کیونکہ میں ان کے غلاموں میں ہوں جنکا نادی — سوکھ کر خار بخط ضعف سے ہو تاق آتش

یعنی وہ شیر خدا حیدر صفدر جس کے — جلوہ خدام سے پیش آکے یا خلاق آتش
روز و شب صفحہ آفاق پہ جس کے ڈر سے — مادرانہ کرے خاشاک پہ اشفاق آتش
اس کے اعدا کا جلانا جو نہ ہوتا منظور — خلق کرتا نہ کبھی حضرت خلاق آتش
اس کے ذمے جو شفاعت نہ ہوئی ہوتی ہو — دیتی عالم میں لگا معشر فساق آتش

امیر المومنین۔ امام المتقین اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب کی ذات گرامی سے جو بے پناہ محبت اور عقیدت مرزا غالب کو تھی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ غالب کا رواں رواں محبت علی سے سرشار تھا بلکہ وہ تو خدا تک رسائی کا راستہ بھی علی ہی کے وسیلے سے ڈھونڈتے ہیں۔ غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست

مشغول حق ہوں بندگی بو تراب میں

اور اس عقیدے کا اظہار ان کے قصیدوں میں بڑی خوش اسلوبی سے ہوا ہے مرزا غالب نے اردو میں صرف چار قصیدے کہے ہیں اور ان میں دو قصیدے حضرت علی کی منقبت میں ہیں ان قصیدوں میں تخیل گہرائی اور گیرائی ہے۔ جو فضا اور لہجہ ہے اس کے عالمانہ اور فکر انگیز ہونے کی وجہ یہ تھی کہ غالب جس ممدوح سے مخاطب تھے وہ کوئی معمولی درجے کا انسان نہیں تھا وہ ایسی شخصیت کی مدح کر رہے تھے جو ان کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی جس کے نام کی نسبت سے اپنے آپ کو پہلے اسد اور پھر غالب کہلوانا پسند کیا۔ ایسے ممدوح کے حضور ذہن و فکر کے بہترین تحفوں کو پیش کرنا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ فکر و فلسفہ کے ہوتے ہوئے بھی ان قصیدوں میں شاعرانہ اور جمالیاتی پہلو جلوہ گر ہیں۔ ایک قصیدے کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مظہر فیض خدا جان و دل ختم رسل — قبلۂ آل نبی کعبۂ ایجاد و یقیں
ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرم خرام — ہر کف خاک ہے واں گردۂ تصویر زمیں
جلوہ پرداز ہو نقش قدم اسکا جس جا — وہ کف خاک ہے پابوس دو عالم کی ایں
نسبت نام سے اس کے ہے یہ رتبہ کہ ہے — ابدالشیت فلک خم شدۂ ناز زمیں
فیض خلق اسکا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا — بوئے گل سے نفس باد صبا عطر آگیں
کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے — رنگ عاشق کی طرح رونق بت خانہ چیں
جسم اطہر کو ترے دوش پیمبر منبر — نام نامی کو ترے ناصیہ عرش نگیں
کس کو ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب — شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں
آستاں پر ہے ترے جوہر آئینہ سنگ — رقم بندگی حضرت جبریل امیں
ترے در کے لیئے اسباب نثار آمادہ — خاکیوں کو جو خدا نے دیئے جان و دل و دیں
تری مدحت کے لئے ہیں دل و جاں کام و زباں — تری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں۔

کس سے ہو سکتی ہے مداحی ممدوح خدا | کس سے ہو سکتی ہے آرائش فردوس بریں
جنس بازار معاصی اسد اللہ اسد | کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حمد، نعت ، منقبت ، مثنوی کے فن کا حصہ بن گئے ہیں اور اس نظم میں اس طرح رچ اور بس گئے کہ کسی ہندو شاعر نے بھی مثنوی کہی تو وہ بھی مثنوی کے ان ارکان سے دامن نہ چھڑا سکا چنانچہ تاریخ ادب کی دوسری، کامیاب ترین مثنوی کے خالق دیا شنکر نسیم نے اپنی شہرہ آفاق مثنوی گلزار نسیم کی کہانی شروع کرنے سے پہلے حمد، نعت اور منقبت کی روایت کو ملحوظ خاطر رکھا۔ اگرچہ ایجاز و اختصار کے اس شہکار میں طوالت کی گنجائش نہ تھی تاہم نسیم نے صرف چار شعروں میں حمد ۔ نعت اور منقبت کا الیساحق ادا کیا جو دوسرے شعرا کے ہاں کئی ابواب میں بھی نہ سما سکتے ۔ اس مثنوی کا ایجاز ۔ اختصار روانی ۔ مناسبت الفاظ ۔ برجستگی محاورات ۔ نادر تشبیہات و استعارات قابل تعریف ہیں اگرچہ اس نظم میں تصنع ضرور ہے لیکن فن کے نقطہ نظر سے اور تخیل کے اعتبار سے ایک معرکۃ آلدرا تصنیف ہے اس مثنوی کے آغاز میں حمد ، نعت اور منقبت میں جو ایجاز ۔ اختصار اور روانی و برجستگی ہے اسے آپ خود ملاحظہ فرمائیں ۔

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری | ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر | حمد حق و مدحت پیمبر
پانچ انگلیوں میں جو حرف زن ہے | یعنی کہ مطیع پنج تن ہے
ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی | کرتا ہے زباں کی پیش دستی

مثنوی اور قصیدے کے علاوہ دیگر اصناف نظم میں بھی منقبتیں لکھی گئیں اور اردو زبان کے شعرا نے اپنے بزرگان دین اور صوفیائے عظام کی شان میں منقبتیں لکھیں حضرت علامہ اقبال کی ذات گرامی کئی اعتبار سے ہمارے ادب کی ایک عظیم شخصیت ہیں ان کی تمام شاعری اسلامی سانچے میں ڈھل کر نکھری ہے اس اعتبار سے پورے اردو ادب میں ان کی شخصیت اور فن منفرد حیثیت کے حامل ہیں وہ عشق رسول میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ان کے نزدیک انسانیت کی معراج تھی ۔ اور اپنے مرد مومن یا انسان کامل کے لئے جن خصوصیات کو ضروری اور اہم گردانا وہ سب ہی خصوصیات تھیں جو ان کو اپنے آقا اور مولے حضرت آقائے نامدار محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات میں نظر آتی تھیں اور ان کی قربت اور محبت کے اثر سے ان کی اہل بیت اور اصحاب میں جو خصائص جلوہ گر تھے ان کی طرف ان کے اردو اور فارسی کلام میں اشارے ملتے ہیں ۔

مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کی شان میں ان کی کوئی مربوط منقبت ان کے اردو کلام میں نظر سے نہیں گذری لیکن اپنے چیدہ چیدہ اشعار میں اقبال نے مولائے کل حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو بڑے خوبصورت اور جامع الفاظ میں ہدیہ عقیدت کا نذرانہ پیش کیا ہے ۔

دل بیدار فاروقی دل بیدار کراری | مس آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

خیرہ نہ کر سکی مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

جسے نانِ جویں بخشا ہے تو نے
اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر ہے

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

یوں تو اقبال کے بعد کئی شعرا نے منقبتیں لکھیں اور اپنے بزرگان سلف کو نذرانے پیش کئے ہیں لیکن چونکہ طوالت کی گنجائش نہیں اس وجہ سے صوبہ سرحد کے اُن شعرا کا تذکرہ کروں گا جنہوں نے اپنے اپنے انداز میں مولائے کائنات اور باب مدینۃ العلم کو خراج عقیدت پیش کیا۔

حضرت سید ضیا جعفری کا شمار صوبہ سرحد کے اُن شعرا میں ہوتا ہے جن کا نام سرحد کی ادبی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ منور رہے گا۔ ضیا جعفری سرحد کے ممتاز اور مایہ ناز۔ ادیب۔ شاعر، مفکر اور صوفی تھے۔ شعر و ادب سے تعلق رکھنے والے لوگ ضیا کی شخصیت اور فن سے پوری طرح واقف ہیں ان کی باغ و بہار شخصیت ہر ادبی انجمن کی روح رواں تھی۔ وہ اپنے سینے میں الساول رکھتے تھے جو ذوق و جدان، کیف و سرمستی سرور و نشاط اور جلال و جمال کی طمانیت بخش آغوش میں پروان چڑھتی ہے وہ زندگی کے مختلف مراحل اور مسائل کے سلسلے میں وسیع تجربے کے حامل تھے۔

مولائے کائنات کی ذات گرامی سے انکو بے پناہ عقیدت تھی۔ چونکہ ان کی زندگی تصوف کے فیضان سے منور تھی اور تصوف کا سرچشمہ مولائے کائنات علی ابن ابی طالب کی ذات گرامی سے پھوٹتا ہے۔ اور تصوف کے تقریباً تمام سلسلے انہی کے فیضان کے مرہون منت ہیں اس وجہ سے آپ کی ذات گرامی صوفیائے کرام کے لئے نہایت گرامی ہے یوں تو حضرت ضیا جعفری کے ہاں حضرت علی علیہ السلام کی تعریف و توصیف میں بہت کچھ ملتا ہے۔ مگر یہ نظم مجھے بے حد پسند ہے۔ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

وہ ابر جھوم جھوم اٹھا چمن چمن شفق کھلا
ذرا تو دیکھ ساقیا نقاب الٹ نظر اٹھا۔

گل دسمن نے کہہ دیا ہے راز عشق برملا
بڑھا سبو پیالہ بھر۔ پلا مجھے مئے ولا

وہ جام جس کی روشنی مہ تمام کو ملی
وہ مئے کہ جس کی سرخوشی ہمارے جام کو ملی

وہ مئے کہ جب پری نبی تو روح میں اُتر گئی
نشہ مئے طہور کا تھا زندگی سنور گئی

زباں پہ بے خودی میں پھر علی کا نام آگیا
ہمارا جام زرفشاں ہمارے کام آگیا۔

علی دلنفس مصطفیٰ۔ علی امام اولیا
علی وہ شیر کبریا۔ ہنر بیشۂ وغا

تمام شان دلبری تمام جان نغمگی
تن حسیں پہ سج رہا ہے جامۂ ید اللّٰہی

چراغ بحر و بر علی۔ جمال خشک و تر علی
چمن چمن روش روش شجر علی ثمر علی

نشاط جان و تن علی۔ جہاں کا بانکپن علی | نظام شش جہات میں بنائے علم و فن علی
نسیم صبح زندگی۔ دل و نظر کی تازگی | میرے بیان و خامشی کی منتہا علی علی
جمال دلستاں کہوں تمہیں میں جان جاں کہوں | اس عرش آستاں کو پناہ دو جہاں کہوں
خلیفۂ خدا علی۔ امام دوسرا علی | وصیٔ مصطفیٰ علی جمال حق نما علی
نظر وہ صبح گلستاں کو موج سے رواں دواں | یہ کارواں آہواں کبھی یہاں کبھی وہاں
زباں پہ ذکر حق رہا ہے بھوک اور پیاس میں | جبیں رہی ہے سجدہ ریز حمد اور سپاس میں
امامت اور ولایت و شہادت ان کے گھر میں ہے | بنائے حسن کو کیمیا اثر وہ اس نظر میں ہے۔
سلام اس پہ جس نے دل کو حاودان بنا دیا | بس اک نظر سے گرد رہ کو کہکشاں بنا دیا۔
ضیا تری اعتبار تن جو فرش بو تراب ہو | یہ خاک آفتاب ہو یہ ذرہ ماہتاب ہو۔

(صفحہ ۱۴۶ سے آگے)

انہوں نے انسانی رفعت کی انتہا معراج سے ثابت کر دی اس کی بدولت اقبال میں یہ خود اعتمادی آ گئی کہ

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے | یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

اور پھر عملی زندگی میں ان کی سیرت پاک ؐ کے اعلیٰ نمونے ان کے لئے مشعل راہ بنے اقبال زندگی کے لئے ان کی سیرت کو معیار بنا کر ہر چیز کو جانچتے ہیں۔ اور وہ اللہ کے پیاروں کی نگاہ کی تاثیر کے قائل اسی لئے ہیں کہ رسول پاک ؐ نے اسلام، پھیلانے کے لئے تلوار نہیں اٹھائی بلکہ نگاہ کی تاثیر سے دلوں کو بدل دیا اور ایک عالم کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اسی سیرت کو دیکھ کر جو قرآن کا عملی نمونہ تھی انہوں نے یوں پیش کیا ہے۔

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا | یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی

اس کے ساتھ ساتھ وہ زندگی کی مختلف طاقتوں کے اثر کا تقابل حضور اکرم کی خوئے مبارک سے کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس کے بادشاہ اپنی عسکری قوت کے بل بوتے پر غالب آتے ہیں تو اللہ کے برگزیدہ بندے اپنے عمل صالح اور "خلق عظیم" سے تمام لوگوں کے دل مسخر کر لیتے ہیں۔ اس لئے اقبال جب آج کل کے مذہبی پیشواؤں سے لے کر سیاسی رہنماؤں تک کے کردار دیکھتے ہیں تو انہیں ان کی نفس پرستی، اقربا پروری اور فریب دہی دکھ پہنچاتی ہے اور وہ ان کو حضور اکرم ؐ کی رہنمائی کے پیمانے سے ناپتے ہیں تو ان رہنماؤں کو بہت کمتر پاتے ہیں اور حقیقت کا اندازہ اس طرح لگاتے ہیں کہ حضور اکرم ؐ اپنی "خوئے دلنوازی" سے دشمنوں کو بھی اپنا بنا لیتے ہیں جبکہ آج کے رہنما کا یہ حال ہے کہ،

کوئی کارواں سے ٹوٹا، کوئی بدگماں حرم سے | کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی

اور حضور ؐ کی نرم دلی اور عفو و درگزر کی قرآن پاک میں جا بجا تعریف کی گئی ہے اور مسلمانوں کو عملی زندگی میں ان کی سیرت

(باقی صفحہ ۱۴۹ پر)

از حشمت جہاں ناز
گورنمنٹ گرلز کالج ایبٹ آباد

اُردو مرثیہ نگاری

واقعہ کربلا تاریخ اسلام کا ایک المناک دتابناک باب ہے جس میں غم واندوہ کی تاریکیاں بھی ہیں اور حق و صداقت، ایمان و یقین کی تجلیاں بھی جو نخل اسلام کی خون جگر سے آبیاری کی بہترین مثال ہے اور خاندان رسالت کی عظیم قربانیوں کی لاثانی داستان بھی۔ جس قربانی ایثار اور شہادت نے کفر والحاد کے چراغوں کو بجھایا۔ فسق وفجور کی تاریکیوں کو مٹایا۔ ڈوبتی ہوئی کشتی امت کو بچالیا۔

حسینؓ اوران کے رفقا نے نانا کی امت اور دین اسلام کی بقا کے لئے اپنے لہو کا ایک ایک قطرہ بہا دیا۔ اس شہادت نے دنیا کی تاریخ ہلادی قصر شہنشاہیت لرز اٹھے دنیا ئے انسانیت چیخ اٹھی۔ ہر فرد۔ ہر انسان، ہر مومن۔ ہر مسلمان، نواسہ رسول کی عظیم قربانی سے متاثر ہوا۔ شاعر بھی اس عظیم شہادت پر نوحہ کناں ہوگئے، عربی فارسی۔ اور اردو شاعری میں ایسی شہادت عظمیٰ نے آگ اور آنسو بھر دیئے۔ اُردو شاعری کی تو یہ گویا ابتداہی ذکر حسینؓ اور شہادت حسینؓ سے ہوئی مرثیہ نگاری اردو شاعری کی تو گویا ابتداہی ذکر حسینؓ اور شہادت حسینؓ سے ہوئی۔ مرثیہ نگاری میں اردو ادب نے جتنی ترقی کی دنیا کے ادب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اگرچہ مرثیہ بھی اردو میں فارسی شعر وادب سے ہی داخل ہوا مگر ہند کی فضاؤں میں اس کو پھلنے پھولنے کے ایسے مواقع میسر آئے تھے جو کسی صنف ادب کو میسر نہ ہوسکے تھے واقعہ کربلا کی عظیم الشان تاریخی حقیقت کو شعر کے قالب میں اردو شعراء نے خراج عقیدت پیش کیا ہے اور اس المناک سانحہ کو جس آب و رنگ سے جلا بخشی ہے شاید تاریخ اسلام کے صفحات میں بھی اس کو وہ درخشانی نصیب نہیں، تاریخ کے صفحات میں تو یہ واقعہ ایک المناک سانحہ ہے مگر اردو شاعروں کے زور تخیل زور قلم اور زور بیان نے اس واقعہ کو ایک درخشاں، درس آموز۔ اور تابناک مینارہ نور بنا دیا ہے۔

ان مرثیوں نے تاریخ کو گھر گھر پہنچایا دنیا میں حسینؓ کا نام چمکایا۔ خاندان رسالت کی عظمت، قربانی کے نغمے بچے بچے کی زبان پر سے جانے لگے۔ واقعہ کربلا کے پس منظر میں جو سیاسی۔ اخلاقی۔ اور مذہبی اقدار جلوہ ریز تھیں ان کو مرثیہ نگاروں نے تفصیل وتجزیہ سے پیش کیا۔ حق وصداقت کے لئے جان دے دینا۔ کفر و باطل کے سامنے سر نہ جھکانا بزرگوں کا ادب ۔ خوردوں کا لحاظ۔ خواتین کا مثالی کردار۔ بچوں کی اطاعت۔ جوانوں کی شجاعت۔ محبت واخوت کے مظاہرے، عبادت الٰہی کے ایمان افروز مناظر۔ تلواروں کی چھاؤں میں سجدے۔ بھوک اور پیاس میں بھی اللہ کے نام پر جان دینے کا جذبہ جس طرح ان مرثیوں میں پیش کیا گیا ہے اردو ادب کی کسی صنف میں نظر نہیں آتا۔

مرثیوں نے مذہب اسلام کی اخلاقی اور روحانی تجلیوں کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ مذہب واخلاق کے عملی پیکروں کو اردو ادب میں حیات دوام بخش دی ہے۔ اسلام کی سچی روح اور حقیقی جذبہ اور ابدی حرارت کو مرثیوں

میں جس طرح پیش کیا گیا ہے تاریخی کتابوں میں بھی وہ تاثیر اور وہ اثر شاید نظر نہیں آتا۔

اردو مرثیہ کی ابتدا دکھن میں ہوئی۔ عادل شاہی اور قطب شاہی ریاستوں میں مرثیہ کے لئے ہوا سازگار تھی۔ اشرف۔ وجہی۔ نوری۔ ہاشمی۔ ذوقی۔ امامی۔ تاہم اور شرف برہانپوری اور ہاشم علی نے مرثیہ نگاری کی ابتدا کی۔ ان کی زبان دکھنی تھی۔ لیکن سوز و گداز ان کا نمایاں وصف تھا۔

دل بند مصطفےٰ کا تابوت لے چلے ہیں

فرزند مرتضےٰ کا تابوت لے چلے ہیں

اس طرح گویا اردو شاعری کی بنیاد ان مجالس میں رکھی گئی جہاں ذکر شہادت حسین ہوتا ہے۔

فرش مجلس کی ہے مرہون زبان اردو

غم شبیر بنا روح روان اردو

نام مولا سے بڑا نام ونشان اردو

شعلہ طور ہوا زور بیان اردو

گوشہ بزم عزا باعث اعجاز ہوا

ماتم سبط نبی نقطہ آغاز ہوا

دکن کا زوال آیا اور مغلوں نے دکن فتح کر لیا شمالی وجنوبی ہند میں آمد ورفت کا سلسلہ بڑھا تو دکھنی مرثیے بھی دہلی پہنچنے لگے۔ امام برہان پوری اور ہاشم برہان پوری کے مرثیہ مقبول ہوئے اسی زمانے میں فضلی نے روضۃ الشہدا کا ترجمہ اردو میں کیا جو دہ مجلس کے نام سے مشہور ہوا۔

اٹھارویں صدی میں مرثیہ کی یہ شکل ہند میں عام تھی جس میں فنی وادبی خوبیاں کم تھیں روتے رلانے کا سامان زیادہ تھا۔ شمالی ہند میں میر اور سودا نے بھی مرثیہ لکھے اور ان کے ساتھ مسکین۔ گدا۔ مونی۔ سکندر اور غمگین نے بھی اس موضوع پر طبع آزمائی کی سودا اور سکندر نے شہادت حسین کے مختلف پہلوؤں کو جمع کر کے ایک مرثیہ میں نظم کیا اور مسدس میں مرثیہ لکھنے کا رواج ہوا۔

یہ میر اور سودا کا احسان تھا کہ مرثیہ نے ایک مستقل صنف سخن کی حیثیت حاصل کی اور کئی دیگر شعرا ابھرے مثلاً دلگیر۔ فصیح۔ میر خلیق اور میر ضمیر وغیرہم کہ ان شعرا نے مرثیہ گوئی کو ایک مستقل فن بنا کر دامن اردو کو مالا مال کیا۔

اب تک مرثیہ کی شکل سادہ تھی میر ضمیر نے اس کی ہیئت متعین کی اور اس کی ترتیب چہرہ۔ رخصت۔ سراپا۔ آمد۔ رجز۔ اسلحہ و گھوڑے کی تعریف شہادت اور آخر میں بین اور دعا کے ساتھ مرثیہ کو ختم کرنا سکھایا۔ رزمیہ مرثیہ لکھے۔ واردات قلبی اور مرقع کشی میں ان کے مرثیہ عظیم منزل کی نشاندہی کرتے ہیں۔

گھر سے حبیب بہر سفر سید عالم نکلے
سر جھکائے ہوئے با دیدۂ پرنم نکلے
خویش و فرزند کمر باندھ کے باہم نکلے
رو کے فرمایا کہ اس شہر سے اب ہم نکلے

رات سے گریہ زہرا کی صدا آتی ہے
دیکھیں قسمت ہمیں کس دشت میں لے جاتی ہے

غرضیکہ خلیق اور ضمیر کی کاوشوں سے انیس و دبیر کے لئے فضا ساز گار ہوئی اور یہ دونوں شہوار اقلیم سخن سامنے آئے ۔ میر انیس اردو شاعری کے نقطۂ عروج پر نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اردو میں وہ مقام حاصل کیا جو ہومر، ورجل اور بالمیک نے دنیا کے ادب میں پہلے حاصل کر رکھا تھا۔ انہوں نے رزمیہ شاعری کے بہترین نمونوں سے دامن ادب کو مالا مال کیا رزمیہ نظم کی دو بڑی خوبیاں مانی جاتی ہیں اوّل یہ کہ نظم کا موضوع مہتم بالشان ہو۔ دوئم یہ کہ انداز بیان پر شکوہ ہو۔ انیس کے مرثیوں میں دونوں خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں

موضوع کربلا کا عظیم الشان واقعہ اور زبان انیس کی۔ جس نے مرثیوں کو شاہکار بنادیا۔ مناظر قدرت کی نقشہ کشی انسانی جذبات کی مصوری، نفسیاتی جزئیات نگاری جنگ وجدال کی تصویر کشی جس طرح انیس کے مرثیوں میں نظر آتی ہے اردو تو کیا فارسی کا بھی کوئی شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

زبان اردو کو لاکھوں نئے الفاظ تراکیب محاورے اور متبادل فقرے عطا کیئے۔ بقول شبلی فصاحت بلاغت کے دریا بہا دیئے۔ جوش بیان مکالمہ نگاری کا حق ادا کر دیا۔ ان خوبیوں میں اردو کا کوئی شاعر ان کے رنگ کا تو کیا پاسنگ برابر بھی نظر نہیں آتا۔ چند اشعار کی نظم یا غزل لکھنا کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن ایک طویل مسلسل واقعہ کو ترتیب وار لکھنا کہ زبان فصاحت میں فرق نہ آئے انیس ہی کا کمال ہے۔

بڑھتا تھا جھومتا ہوا جب دم شبیر نر
گرتا تھا ڈر کے کوئی ادھر کوئی ادھر
تیغیں جو کھینچ گئیں تو ہوا اور شور و شر
گھبرائے اہلبیت شہنشاہ بحر و بر

آغوش میں پھوپھی کے سکینہ دہل گئی
غل پڑ گیا کہ گھاٹ پر تلوار چل گئی

مرزا دبیر کے مرثیے انیس سے ضخامت میں زیادہ ہیں البتہ سلاست و روانی میں انیس سے کم ہیں۔ دبیر کا انداز

جدا ہے. لفظی صنعت گری مناظی اور مرصع کاری میں یہ منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔

غرض انیس و دبیر پر مرثیہ گوئی ختم ہو گئی ، اور ان کے بعد وہ بات کسی اور شاعر میں پیدا نہ ہو سکی ۔ انیس و دبیر کے خاندان کے علاوہ لکھنؤ میں گھر گھر مرثیہ گوئی کا چرچا تھا. مونس اور انس تو خلیق کے بیٹے تھے ۔

مرزا نعشق ۔ فاخر ۔ جاوید ۔ آشفتہ وغیرہ بھی اپنے اپنے رنگ میں اردو مرثیہ کی آبیاری میں مصروف تھے خاندان انیس میں کئی ایسے مرثیہ گو بھی گذرے ہیں جنہوں نے اپنے بزرگوں کے نام کو روشن رکھا. مونس اور انس کے بعد میر انیس کے بیٹے نفیس اور پوتے عروج ۔ نفیس کے نواسے عارف اور انیس کے نواسے پیارے صاحب رشید صف اوّل کے مرثیہ گو شمار ہوتے تھے . رشید صاحب کے مرثیہ زبان کی صفائی روزمرہ محاورہ . سلاست اور روانی میں منفرد ہیں ۔ ساقی نامہ اور بہاریہ کو مرثیوں میں شامل کیا اور زور بیان کا حق ادا کر دیا ۔

انیس و دبیر نے ادبی اعتبار سے مرثیہ کو اس منزل پر پہنچا دیا تھا کہ اردو کا ہر شاعر اس تک پہنچنے کی کوشش میں ایک آدھ مرثیہ ضرور کہہ گذرتا تھا. شاد عظیم آبادی آغا شاعر دہلوی نجم آفندی نے اچھے مرثیے اور نوحے کہے ۔جوش ملیح آبادی موجودہ دور کے تمام مرثیہ گویوں میں بلند مرتبہ کے مالک ہیں ۔ انہوں نے مرثیہ کی قدیم روایت کا دامن چھوڑ دیا ہے. مگر انداز بیان کا زور شور ۔ الفاظ کی گھن گرج ۔ الفاظ و تراکیب کی تراش خراش متضاد و مترادف الفاظ کا بہاؤ مرثیہ کو ایک نیا اسلوب عطا کرتا ہے ۔

مرثیہ میں حسینؑ کی ذات اور ان کی شہادت رونے رلانے کا ذریعہ نہیں رہتی بلکہ عظمت ۔ جاہ و جلال صبر و تحمل اور اسلامی تعلیمات کا پیکر نظر آتی ہے ۔

جو دہکتی آگ کے شعلوں پہ سویا وہ حسینؑ
جو جواں بیٹے کی میت پر نہ رویا وہ حسینؑ
جس نے سب کچھ کھو کے پھر بھی کچھ نہ کھویا وہ حسینؑ
جس نے اپنے خون سے عالم کو دھویا وہ حسینؑ

وہ کہ سوز غم کو سانچے میں خوشی کے ڈھال کر
مسکرایا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

لکھنؤ کے علاوہ مرثیہ گوئی کا میدان وسیع ہو کر دیگر شہروں تک جا پہنچا تھا ۔ پاکستان بنا تو شعر و شاعری کے ساتھ ہی مرثیہ گوئی کی مجلیں کراچی میں برپا ہوئیں ، رئیس امروہوی اور آل رضا کے مرثیہ ادب کے اس گوشہ کو روشن کئے ہوئے تھے ۔ اسی دور میں آغا سکندر مہدی نے مرثیہ گوئی کا آغاز کیا اور یکے بعد دیگرے مرثیوں کی چار جلدیں شائع ہوئیں ۔ آپ کے مرثیوں نے ایک مرتبہ پھر یہ ثابت کر دیا کہ مرثیہ گوئی انیس و دبیر پر ہی ختم

نہیں ہوئی ۔ اس دور میں بھی مرثیہ کہا جاسکتا ہے اور مقبول ہو سکتا ہے ۔ آپ نے قدیم روایت سے ہٹ کر مرثیہ میں توحید نبوت ، امامت ، شہادت اور بین کو مرثیوں کے اجزائے ترکیبی بنایا اور انصار کی مدح ۔ اسلام کی عظمت ۔ حسینؑ کی شہادت حضرت زینب کی ہمت و جرأت کو مرثیوں میں اس طرح پیش کیا ہے جس سے واقعہ کربلا کی اہمیت نئی نسلوں کے لئے مشعل راہ بن جاتی ہے اور مرثیہ اہل اسلام کی شان ، عظمت ایثار و قربانی اور جاہ و جلال کے نقیب اور مظہر بن جاتے ہیں ۔ اور ثابت ہوتا ہے کہ اردو مرثیہ تمام اصناف سے زیادہ اہم اور مذہبی اقدار کا آئینہ دار ہے ۔

مرثیہ شدت افکار کا بہتا دریا — مرثیہ عظمت افکار کا بہتا دریا

مرثیہ شوکت افکار کا بہتا دریا — مرثیہ ندرت افکار کا بہتا دریا

مثنوی ہو کہ قصیدہ کہ رباعی کہ غزل — مرثیہ نظم کی اصناف میں سب سے افضل

(صفحہ ۱۴۲ سے آگے)

کو مثال بنا کر چلنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا گیا ہے ۔ " لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ " ترجمہ ۔ " تمہارے لئے رسول اللہ کی ہستی میں بہترین نمونہ ہے ۔"

رسول اکرمؐ کی ذات سے روشنی پانے والے اور ان کی سیرت سے ہدایت پاکر قرآن پاک کو زندگی کا سرمایہ سمجھنے والے صحابہ کرامؓ بھی اقبال کی شخصیت پر اثر انداز ہوئے اور ان کی عملی زندگی کے مختلف عمل اور فیصلے ان کی زندگی کو نئے موڑ دے گئے ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا صدق و خلوص اقبال کو ان کا شیدائی بنا گیا کہ ان کی زندگی کا کا حاصل وہ تھا

ڈاکٹر انعام الحق کوثر کوئٹہ

بلوچستان کے اردو نعت گو شعرا

(قیام پاکستان سے پہلے کے)

خدائے قدوس وحدہ لاشریک کی حمد کے بعد دنیا بھر میں جس ہستی کی سب سے زیادہ تعریف اور توصیف بیان ہوئی ہے وہ حضور پاک سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات ہی ہے۔ اس زمرے میں کسی قوم، گروہ یا مذہب کی کوئی قید نہیں کیونکہ غیر مسلم تک جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں رطب اللسان نظر آتے ہیں ہندو شعرا میں چودھری دلو رام کوثری نے جو خود کو فخریہ انداز میں اردو کا حسان بن ثابت سمجھتے تھے۔ نعتیہ اشعار رسمی طور پر نہیں بلکہ عقیدت کے لحاظ سے کہے ہیں جیسے ؎

کچھ عشق پیمبر میں نہیں شرط مسلماں
ہیں کوثری ہندو بھی طلب گار محمدؐ

قدیم شعرا تو اس دستور پر عمل پیرا رہے کہ خواہ کچھ بھی نظم کریں حمدیہ اشعار کے بعد نعتیہ اشعار ضرور رہو تے ہیں کم وبیش یہ انداز بیسویں صدی کے اوائل تک رہا ہے۔ بعد ازاں یا تو اس سے صرف نظر کیا گیا یا پھر مستقل طور پر نعت ہی کو موضوع سخن بنایا گیا۔

بلوچستان میں ۱۹۱۱ء کے لگ بھگ لورالائی میں مشاعروں کا آغاز ہوا ان مشاعروں میں شرکت کرنے والوں کے نام یہ ہیں:۔ سردار محمد یوسف خان پوپلزئی، مولوی عبدالحنان احقر، عنایت اللہ خان ایاغ، خان بہادر نبی بخش خان اسد چراغ الدین چراغ، محمود خان محمود، نانک سنگھ نانک، فتح چند نسیم، عابد شاہ عابد، عنایت علی عنایت، ہرکرن داس ہرکرن پنڈت جیون سنگھ مسکین، سردار غازی خان، شیخ محمد عبدالحق وغیرہ، ۷، جون ۱۹۱۵ء کو لورالائی میں مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس کے سیکرٹری سردار محمد یوسف خان یوسف تھے۔ مصرع طرح تھا:

وہ شبنم ہوں پہنچ سکتا نہیں دیوار گلشن تک۔

اس مشاعرہ میں بعض شعرا نے نعتیہ اشعار بھی پڑھے تھے جیسے مولوی عبدالحنان احقر الف نویس درجہ اول لورالائی

تمنا ہے کروں میں صاف گلیاں اپنی پلکوں سے
سر یثرب! اگر پہنچائے قسمت تیرے مسکن تک

بابو عنایت اللہ خان ایاغ: یہ پیش حق کسی نے تو پسارے ہاتھ ہی ہوں گے
تمہارے واسطے میں نے تو پھیلایا ہے دامن تک

جناب نبی بخش اسد، نائب تحصیلدار لورالائی

رسائی ہو کہیں یارب شہر یثرب ؐ کے مدفن تک

کہ گلخن سا، جدائی سے، ہوا جاتا ہے گلشن تک

سردار محمد یوسف خان یوسف پوپلزئی تحصیلدار لورالائی

شفیع المذنب ہے رحمت للعالمین ؐ ہے تو

میں چھوڑوں کس طرح داماں ترا محشر کے دامن تک

عابد بلوچستانی نے اپنا ایک مختصر سا مجموعہ کلام گلزار عابد کے نام سے ماہ ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ مطابق ماہ اکتوبر، ۱۹۱۵ء میں مطبع قاسمی واقع دیوبند سے چھپوایا تھا اس کے کل صفحات ۴۸ ہیں سید عابد شاہ نے کہا تھا۔

محمد ؐ شافع ہے روز حشر کا	محمد ؐ شافع ہے سب عاصیوں کا
محمد ؐ شافع ہے روز حشر کا	محمد ؐ ہے دوا ہر درد دل کا

میں عابد ہوں غلام ہر چار سرور کا

ابابکر ؓ کا عمر ؓ کا عثمان ؓ کا علی ؓ کا

محمد صادق شاذ بلوچستان کے مشہور معروف شاعر اور ادیب تھے جنہوں نے یہاں علمی و ادبی سرگرمیوں کو عام کرنے کے لئے بڑی تگ و دو کی تھی ۱۹۲۹ء میں ایک انجمن خدام المسلمین کوئٹہ کی داغ بیل بھی ڈالی تھی۔ جو ۱۹۳۵ء تک قائم رہی یہ اصلاحی انجمن تھی۔ مولانا ثناء اللہ کے ساتھ نماز کمیٹیاں بھی بنائی تھیں۔ اردو کے اشعار پڑھ پڑھ کر لوگوں کو نیند سے بیدار کرتے تھے

جیسے ؎ اے محمد ؐ کی آنکھوں کے تارو اٹھو

رات غفلت میں تم نے گذاری اٹھو

ڈاکٹر محمد اسحق صدیقی ناشط ادیب، شاعر، متواضع، مہمان نواز، شاہ خرچ اور بڑے دوست نواز انسان تھے اپنی سال بلوچستان کے مختلف مقامات میں گزارے، بیشتر وقت موسیٰ خیل، فورٹ سنڈیمن مسلم باغ اور سبی میں گزارا ۳۰ جولائی ۱۹۳۱ء کو فورٹ سنڈیمن میں حسب فرمائش مولوی غلام نقشبندی خان حضور پاک سرور کائنات کے حضور جو گلہائے عقیدت پیش کئے تھے ان میں سے تین شعر یہ ہیں۔

سچ ہے لطف زندگی اس کو حاصل ہو گیا	جو نبی ؐ کے نام لیواؤں میں شامل ہو گیا
بالیقیں دنیا و مافیہا سے مستغنی ہے وہ	سرور کونین کے در کا جو سائل ہو گیا
ذرۂ حب نبی ؐ ناشط ہے جس کے قلب میں	جنت الفردوس میں وہ شخص داخل ہو گیا

بلوچستان کے مرد مجاہد اور مرد قلندر نوابزادہ یوسف علی خان عزیز مگسی (المتوفی ۱۹۳۵ء) اپنے بعض شعروں میں آنحضرت صلعم

کا ذکرِ مبارک اس طرح کرتے ہیں۔

گاندھی و مالوی کے وسوسے دھرے رہ جائیں — میں اگر قولِ محمد کو نمایاں کر دوں

بس یہی آرزو ہے کہ اسلام پہ مروں — ناموسِ مصطفیٰ کے بڑے نام پہ مروں

وہ زیب عرب، وہ فخر عجم روتا ہے تمہاری غفلت پر

اُٹھ تھام لے باگیں دنیا کی، غازی کہلا، اُٹھ ہمت کر

میر محمد حسین عنقا کا مجموعہ کلام ۱۹۳۴ء میں کراچی سے "رحیل کوہ" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ جو سرورق سمیت ایک سو صفحوں پر مشتمل ہے "فریاد" (پیارے نبی کی پیاری جناب میں) شاعر کہتا ہے۔

اے نبیوں کے نگین تجھ کو نبوت کی قسم

شافع امتِ عاصی ہے، شفاعت کی قسم

جن مسلمانوں نے اسپین میں تیرا گاڑا علم

ان کی اس جان سپاری و صداقت کی قسم

کر دعا بہر خدا حق میں بلوچستان کے

اس پہ ارزاں ہوں تا لطف و کرم یزداں کے

سید صغیر حسین اصغر انبالوی ۱۹۲۸ء میں لاہور سے کوئٹہ آ گئے۔ بلوچستان بھر کے مختلف مقامات میں سالہا سال بسلسلہ ملازمت مقیم رہے، آپ کا مجموعہ کلام "دست سبو" کے نام سے چھپا۔ دو تین نعتیہ شعر سماعت فرمائیے۔

اٹھائیں آنکھ ہم کس طرح سوئے روضۂ رضواں

کہ اپنی آنکھوں میں روضہ ہے محبوب الٰہی کا

کلیم اللہ بنا کوئی خلیل اللہ بنا کوئی

لقب شاید ترے ہی واسطے ہے مصطفائی کا۔

دل اصغر بہت بیتاب ہے دردِ جدائی سے

کرم کیجیے، خدارا، وقت ہے مشکل کشائی کا۔

محمد صبغتہ اللہ صدیقی تخلص ارشد بلوچستان کے معروف شاعر تھے ۱۹۱۸ء میں کوئٹہ آئے آپ نے ہر صنف میں خامہ فرسائی کی؛ ہدیہ نعت ملاحظہ ہو؛ آئے نظر مجھ کو مدینے کے بام و در — سجدے تڑپ کے آئے جبیں سے نگاہ میں

اللہ رے یہ درسِ مساواتِ مصطفیٰؐ — کچھ فرق ہی نہیں ہے غلام اور شاہ میں

غلام محمد جمیل کے قلمی دیوان بکلام نقش جمیل سے کہتے ہیں۔

اللہ رے یہ ساقی کوثر کا تصور

سر پر مرے مستانہ گھٹا چھائی ہوئی ہے

پروفیسر آغا صادق حسین صادق ۱۹۴۳ء میں کوئٹہ آ گئے تھے "چشمہ کوثر" نعت و منقبت کا مجموعہ ہے۔ رموز نام محمدؐ کا ایک بند دیکھیے : کیا بات پیدا کی۔

میم سے کاش مسلمان بھی مسلماں ہوجائے — ح سے الحمد کی تبدیل فرد زاں ہوجائے

میم سے مرکز اسلام کا ساماں ہوجائے — دال سے دہر کی تقدیر درخشاں ہوجائے

چاند بھی دیکھ کے اس نور کو شرماتا ہے

کوئی نقطہ نہیں بے داغ نظر آتا ہے،

نبی بخش اسد ۱۹۳۴ء میں ملازمت سے ریٹائر ہو کر سابقہ ریاست لس بیلہ کے وزیر بنے تھے۔ ان کے کلام پر مبنی ایک پمفلٹ چھپا تھا جو "سلام والتجا" بحضور سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مبنی ہے اس کے دو شعر یہ ہیں۔

باعث ایجاد عالم نور یزداں کو سلام — سید اولاد آدم ظلِ سبحانی کو سلام

دستگیر عاجزاں پشت و پناہ بے کس — دلنوازِ عاشقانِ خستہ حالاں کو سلام

حق تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے : وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کے ذکر کو رفعت بخشی)۔ ذکر حبیبؐ کی یہ سربلندی تاریخی ادوار، جغرافیائی قیود، اقوام و ملل کی تقسیم، رنگ و نسل کی تفریق اور زبان و ادب کے پیمانوں سے بہت زیادہ بالا ہے۔ اسی لئے نعت کا موضوع لامحدود ہے۔ شاعر اپنے نعتیہ اشعار میں انسانوں کی توجہ زندگی کی اعلیٰ ترین اقدار کی طرف منعطف کراتا ہے۔ اور اس طرح زندگی اور انسانی معاشرے کو زندہ تر اور پائندہ تر بنانے کی سعی بلیغ کرتا ہے یوں ہر دور میں نعت کی اہمیت، ضرورت اور افادیت روز روشن کی مانند ظاہر ہوجاتی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد اردو نعت کے ارتقاء کی رفتار بہت تیز ہوگئی اب تک سو کے لگ بھگ مجموعہ ہائے نعت منظر عام پر آ چکے ہیں ان میں سے ایک فخر کونینؐ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ جو وادی بولان کے ایک عظیم صاحب دل شاعر جناب محشر رسول نگری کا ایک علمی و ادبی شاہکار ہے یہ کتاب حسن اور حقیقت کا ایک نادر امتزاج ہے، اس سے ادبیات سیرتؐ میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا ہے اس تخلیق پر وادی بولان اگر مسرت و طمانیت سے جھوم اٹھے تو بجا ہے بالکل بجا ہے اس کے پہلے حصے کا ترجمہ انگریزی میں چھپا ہے۔

"فخر کونینؐ" میں جس قسم کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اسی کی مناسبت سے اظہار میں شکوہ، دبدبہ، لچک، حلاوت اور شیرینی پائی جاتی ہے میدان کارزار کا ذکر کرتے ہیں تو رزمیہ انداز میں ہے۔ جناب سیدہؓ کے شادی عقد کا تذکرہ آتا،

ہے تو لہجہ اور ہے۔ سردارِ کونین بیٹی کو جہیز میں کیا دیتے ہیں محشر کے الفاظ میں سنیئے۔

میکے سے لے چلی ہے مشقت جہیز میں
دی ہے نبیؐ نے فقر کی دولت جہیز میں

پائی ہے اُس نے چادرِ عفت جہیز میں
حضرتؐ سے لے گئی ہے وہ جنت جہیز میں

بیٹی کوئی نہ باپ سے دولت یہ پا سکی
اخلاق حق سے یوں نہ گھر اپنا سجا سکی

رسول کریمؐ کا الطاف عام ملاحظہ ہو:

انسانیت ملے گی یہیں کائنات میں
تکمیل پا چکی ہے محمدؐ کی ذات میں

تیری نظر سے قسمت انسان بدل گئی
درجِ حیات اک نئے سانچے میں ڈھل گئی۔

آنحضرتؐ کی شخصیت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ ؎

ہیبت سے کانپتا تھا جو ملتا تھا پہلی بار
ہوتا تھا جب قریب تو بنتا تھا جاں نثار

محشر صاحب نے نعتیں بھی کہی ہیں۔ اکثر ریڈیو پاکستان سے نشر بھی ہوئی ہیں مثلاً دو تین شعر سنیئے۔

مدینے کے وہ بام ودر اللہ اللہ
کہاں جا کے ٹھہری نظر اللہ اللہ

یہاں قدر ہوتی ہے اخلاص دل کی
یہاں آپ جھکتا ہے سر اللہ اللہ

نگاہوں کی جنبش بھی سوئے ادب ہے
یہ آئینِ اہلِ نظر اللہ اللہ

قیوم راشد کا مجموعہ کلام "بربط ناہید" ۱۹۴۸ء میں کوئٹہ میں چھپا وہ سرکارِ دوعالم کے حضور گویا ہیں ؎

کھلی جس سے ہم پر خدا کی حقیقت
محمدؐ وہ درس خودی لے کر آئے

ہمیں ہیں کہ اب اس کو ٹھکرا رہے ہیں
خدا سے جو اپنے نبی لے کے آئے

ڈاکٹر عبدالحمید حمید کاکڑ کا مجموعۂ کلام شائع ہو چکا ہے۔ کہتے ہیں۔

دو عالم پر تو ہے قبضہ ہ ا . . . سول اللہؐ
کہیں کیوں کہ ہم ہیں بے سہارا یا رسول اللہؐ

جناب عیش اس مصرعے پہ مصرعہ لگ نہیں سکتا
ہیں محتاج سائے کا قد بالا محمدؐ کا

بقول رشید نثار: اسی ہادیٔ کل تا جور بزم دو عالم
اب تیرے سوا کوئی نگہدار نہیں ہے۔

صادق نسیم ۲۷ جون ۱۹۵۸ء سے ۱۵ دسمبر ۱۹۶۵ء تک کوئٹہ میں مقیم رہے آپ نے کوئٹہ میں کئی کل پاکستان مشاعروں کا انعقاد کرایا آپ کا کلام ملک کے بلند پایہ اور معیاری رسائل نقوش، فنون، اوراق وغیرہ میں چھپتا ہے چند نعتیہ شعر یہ ہیں۔

کیوں کہتی ہے دنیا کہ ہیں یثرب کے مکیں آپ — جھانکا ہے جو دل میں تو ہیں موجود یہیں آپ
توصیف ہو مقصود تو الفاظ نہیں ہیں — کونین کی ہر شے سے جمیل آپ حسین آپ

ہر علم ہوا آپ کے پرتو سے منور — اُمی کہوں کیسے کہ ہیں قرآن میں آپ
عباس محمد عیاض کی آواز آتی ہے — لگا لیتے ہیں او جو احمد نثار سے ہمدم
ایسے ہی لوگوں سے خدا کو پیار ہوتا ہے۔

ملک محمد رمضان بلوچ کہتے ہیں — درد چمکا رہی ہے تیری یاد
پھول برسا رہی ہے تیری یاد

نور محمد حمدم ۱۹۴۳ء سے کوئٹہ میں اقامت گزیں ہیں، غزل، نعت، نظم اور اقبال اور خسرو کے کلام پر اشعار لکھے ہیں۔ دو تین نعتیہ شعر سماعت فرمائیے:

مقتل کے دشت و در صلِّ علیٰ کی دھوم سے ہمدم — سراپا خلد کی آب و ہوا معلوم ہوتی ہے۔
فرصت ہے کہاں خوفِ خورشیدِ قیامت کی — ہر آن تصور میں دامانِ محمدؐ ہے۔
عصیاں کا خوف ہے نہ عبادت پہ ناز ہے — اُس طرف ہے نثار کی عادت پہ ناز ہے۔

سید عابد رضوی کو ادب کا شوق ورثے میں ملا۔ آپ نے باقاعدہ کچھ نعتیہ قصیدے روایتی انداز میں کہے ہیں دو نعتیہ شعر یہ ہیں: اے فخرِ شرفِ کعبہ دین بشریت — تو ہی تو ہے مسجودِ ملائک کی حقیقت
تیرے الطاف سے ہے توقیرِ عبادت قائم — ترے دامن سے ہے وابستہ دو عالم کی اماں

ظفر خان نیازی کا ہدیہ نعت ملاحظہ ہو:
آنکھ ہے بے نور وہ جس میں نہیں ہیں تیرے خواب — دل وہ، پتھر ہے جو تیری یاد میں دھڑکا نہیں

ماہر القادری گویا ہوتے ہیں

اللہ نے پیدا کئے جتنے بھی پیمبر
اِک ایک ہے آئینہ افکار محمدؐ

سرور سودائی کہتے ہیں : یہ اوجِ آدمِ خاکی اسی نظر سے ہے
وگرنہ ہم ہیں کہیں اور کہیں محمدؐ ہیں

خورشید افروز : سارا عالم تیرگی کو روشنی کہتا ہے کیوں ؟ بھولتی جاتی ہے یہ دنیا ترے سچے اصول

سعید گوہر : سینۂ خلا بھی ہو جاتا ہے جس سے چاک چاک گفتگو میں وہ اثر دے یا محمد مصطفیٰؐ

رب نواز مائل : وقعت ہزار لفظ کی بڑھ جائے کیا سے کیا
ہاں سامنے جو ہو وہی گفتار محمدؐ

قاضی محمد عالم ضمیر : کیوں نارِ جہنم سے ضمیرؔ آئے اسے خوف
حاصل ہو جسے سایۂ دیوارِ مدینہ

اخگر سہارنپوری حضرت احمد سہارنپوری کے شاگرد رشید ہیں نعتیہ اور تغزل دونوں رنگ خوب ہیں۔ کہتے ہیں۔

مجھے دولتِ عشق احمدؐ ملی ہے مری زندگی اک حسیں زندگی ہے
اٹھا بحرِ رحمت میں بخشش کا طوفاں مری آنکھ جس وقت گریاں ہوئی ہے

اثر جلیلی، جلیل مانک پوری جانشین امیر مینائی کے شاگرد رشید ہیں آپ نے باقاعدہ طویل نعتیہ قصیدے کہے ہیں جن میں روایت رچی بسی ہوئی ہے۔ گویا ہوتے ہیں۔

اے خوشا شانِ رسالت رحمت اللعالمینؐ عرش بھی ہے زیرِ پائے رحمت اللعالمینؐ
دولتِ قارون ہو یا حشمت پرویز ہو ہیچ ہے سب ماسوائے رحمت اللعالمینؐ
دولتِ دنیا بھی ہے سرمایۂ عقبیٰ بھی ہے اے اثرؔ ذوقِ ولائے رحمت اللعالمینؐ

بلوچستان میں اس کاروانِ عقیدت میں اور بھی کئی حضرات شامل ہیں جیسے عطا شاد، سلطان نیازی، سید جعفر، طاہر مرحوم، حافظ محمد ابراہیم اور چودہری فضل حق وغیرہ

روضۂ مقدسہ پر حاضر ہو کر جناب محشر رسول نگری نے پہلے تو دورِ حاضر کی تمام آزمائشیں مصیبتیں اور آفتیں ایک ایک کر کے بیان کی ہیں جو اس وقت مختلف اسلامی ملکوں پر تاریک گھٹاؤں کی مانند چھائی ہوئی ہیں آخر میں سرورِ دیں بے تاب اور بے قرار دلوں میں مچلتی ہوئی اور تڑپتی ہوئی آرزو کو یوں پیش کرتے ہیں۔

شاہا دلوں کو ولولۂ انقلاب دے ہر نوجوان کو جوشِ دلِ بوترابؓ دے

اقبال اور حبِ رسولؐ

آنسہ سعیدہ مہتاب

قرآن مجید کلام الٰہی ہے جو دینِ اسلام کی مذہبی کتاب ہے اس کو بلا مبالغہ زندگی کا پیامبر اور حقیقتوں کا ترجمان ہے اس آسمانی رحمت نے ہمیشہ مسلمانوں کو منفی رویوں کی تاریکی سے نکالا اور جد وجہد کے ذریعے اثباتِ ذات کی تلقین کی کیونکہ اثبات ذات انسان کی صلاحیتیں ہی اجاگر نہیں کرتا بلکہ وہ اسے یقین کی دولت سے بھی مالا مال کر دیتا ہے اور یقین وہ راہ ہے جس پر چل کر انسان "بالغیب" کا قائل ہو جاتا ہے اور اثبات اللہ کی منزل پا لیتا ہے۔ اور یہی انسان کی جد وجہد کی انتہا اور یہی اس کا اعلیٰ ثمر ہے۔

اقبالؒ اثباتِ ذات کا شاعر ہے اس لیے اس نے جب شاعری کی تو اس کی بنیاد بھی ثبت رویے اور کیفیات بنیں۔ اس نے منفی نقطہ ہائے حیات دیکھے۔ ان کے نتائج اور عوامل کا مشاہدہ و مطالعہ کیا اور اپنی شخصیت کو منفیت کی تلخیوں، سے بچائے گیا۔ منفی رویوں سے آگاہی کے سبب اقبال کے ہاں شعوری اور عاقلانہ اثباتی رویہ ملتا ہے جو اس کے تفکر کی گہرائی اور وسعت کی دلیل ہے اس کی وجہ اقبالؒ کی شخصیت کے بعض پہلو بھی ہیں جو ایک دوسرے کے عمل اور ردعمل بن کر ایک دوسرے کے نقائص کو واضح کر دیتے ہیں تو اقبال ان نقائص کو دور کر کے صحیح نقطہ نظر مرتب کرنے لگتے ہیں وہ اپنے ماحول کے خلاف احتجاج بھی کرتے ہیں لیکن اس میں بھی وہ بھڑک اٹھنے، شعلے کی صورت مخالفت کو خس و خاشاک کی طرح جلانے کی بجائے مسلسل اور دھیرے دھیرے مضوبے کے تحت زیادہ ہونے والے شعلے کی طرح رکاوٹوں کو ختم کرنے کے قائل ہیں۔

اقبالؒ کے ہاں اس نقطہ نظر کا پیدا ہونا اور جزوِ حیات ہو جانا، عشقِ رسول اور عشقِ الٰہی کے سبب ہے اقبال کی شخصیت کی تعمیر عشقِ رسولؐ سے ہوئی جس نے انہیں دل گداز اور چشم بینا عطاکی۔ آپ عشقِ رسول میں یہاں تک سرشار تھے کہ آنحضرت صلعمؐ کا خیال ذہن میں آتے ہی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں اور نام رسولؐ لکھتے دل و نظر کے ساتھ ساتھ ہاتھ اور قلم بھی وجد میں آجاتے تھے اور وہ سرورِ کائنات کو تخلیقِ عالم کا باعث سمجھتے تھے اور اس کو بڑے جذبے کے ساتھ بیان کرتے تھے۔
آپ اپنے والدِ بزرگوار کے شکر گذار ہیں کہ ان کے توسط سے وہ رسول اکرمؐ سے وتقع ہوئے اسی لئے کہتے ہیں کہ

از پدر تا نامِ تو آموختم
آتش ایں آرزو افروختم

اور اس نام گرامی کو جاننا اور جزو زندگی بنانا عین حیات سمجھنے میں اقبالؒ برحق تھے کہ وہ ذات گرامی ایسی ہے کہ

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی

اے زمیں از بارگاہت ارجمند
آسماں از بوسۂ بامت بلند

شش جہت روشن زتاب روئے تو
ترک وتاجیک وعرب ہندوئے تو
از تو بالا پایۂ این کائنات
فقرِ تو سرمایۂ این کائنات
در جہاں شمع حیات افروختی
بندگاں را خواجگی آموختی

اور اس ہستی برحق رحمۃ للعالمین کا خیال دل میں جاگزیں ہوا تو شعلۂ عشق تن دمن کو روشن کر گیا اور اس کا بیان یوں کیا۔

عشق در من آتشے افروخت است
فرحتش باد کہ جانم سوخت است
نالۂ مانند نے سامانِ من
آں چراغ خانۂ ویرانِ من
از غمِ پنہاں نگفتن مشکل است
بادہ در مینا نہفتن مشکل است

اور اس عشق کی گرمی اور تڑپ کو آسان کرنے والی ہستی بھی رسول اکرمؐ ہی کی ذات جن کے متعلق ایک نعت میں فرمایا ہے کہ

اے کہ بردِ لہار مرزِ عشق آسان کردہ ای
سینۂ ہا را از تجلی یوسفستان کردہ ای

اس جذب و مستی میں مقام رسول کا تعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

در دلِ مسلم مقام مصطفیٰ است
آبروے ما زِ نامِ مصطفیٰ است
قوت قلب وجگر گردد نبیؐ
از خدا محبوب تر گردد نبیؐ
چوں بنامِ مصطفیٰ خوانم درود
از خجالت آب می گردد وجود

اور فرماتے ہیں۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

اور اسی عشق و مستی نے اقبال سے نعت کے ایسے شعر کہلوائے جو دوسرے نعت گو شعراء کے دواوین پر بھاری ہیں یہ شعر ملاحظہ کیجیے جن میں شعریت، فن کاری، عشق کی گرمی، اور جذب کا سرور اپنی انتہا پر ہے، ان کی تاثیر ایسی ہے کہ انہیں پڑھتے ہوئے ان کی روح جو عشق سے ظہور پذیر ہوئی ہمارے قلب وجگر میں جاری وساری ہو جاتی ہے دیکھیئے فرماتے ہیں

وہ دانائے سبل، ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسین وہی طٰہٰ

اور جس ہستی سے انسان کو محبت ہوتی ہے اسی سے گلے شکوے کرتا ہے اسی کو اپنے دکھ درد بتاتا ہے اور اقبال کا دکھ اور گلہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ قوم محمدؐ گمراہ ہو رہی ہے اس کی بھلائی کے لئے رسولِ اکرمؐ سے مدد کے خواستگار ہوتے ہیں اور کہتے ہیں۔

گردلم آئینہ بے جوہر است
ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
اے فروغت صبح اعصار و دہور
چشم تو بینندۂ ما فی الصدور

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن   ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
تنگ کن رختِ حیات اندر برم   اہل ملت رانگہدار از شرم
سبز کشتِ نابسامانم مکن   بہرہ گیر از ابرنیسانم مکن
خشک گرداں بادہ در انگور من   زہر ریز اندر مئے کافور من
روز محشر خوار و رسوا کن مرا   بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا
گر دُرِ اسرار قرآں سفتہ ام   با مسلمانان اگر حق گفتہ ام
اے کہ از احسانِ تو ناکس کس است   یک دعایت مزد گفتارم بس است
عرض کن پیشِ خدائے عز و جل   عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل

اور یہ قوم مسلمان اس محمدؐ کی اُمت ہے جس کی نمو پذیری کے لئے دنیا کا ہر اہم اور غیر اہم واقعہ ظہور میں لایا گیا اس میں ایک کے متعلق اقبال نے یوں فرمایا کہ

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت   تا چراغِ یک محمدؐ بر فروخت

تاریخ میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا دین اپنی تکمیل اور معراج میں، دینِ محمدیؐ، کہلایا یہی وجہ ہے کہ دینِ رسولؐ کے متعلق کہا گیا کہ "تمہارے باپ ابراہیمؑ کا دین ہے" (سورۃ الحج، ملۃ ابیکم ابراہیمؑ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمد صلعمؐ سلسلہ انبیاءؑ کی انتہا تھے اور خاتم النبیینؐ کہلائے یہی سبب ہے کہ اقبال حضرت محمدؐ سے اپنی وابستگی اور رسول شناسی اور قرآن پاک کو جاننے کے متعلق کہتے ہیں "جب میں ایف اے میں پڑھتا تھا تو صبح کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا والد صاحب مسجد سے نماز پڑھ کر آتے تو میں کبھی منزل ختم کر چکا ہوتا، کبھی جاری ہوتی ایک دن آ کر پوچھتے ہیں کہ کیا پڑھتے تھے؟ مجھے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آ گیا۔ چھ مہینے ہو گئے اور ہر روز دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم پڑھتا ہوں پھر یہ سوال کیسا؟ نہایت نرمی سے فرمایا، میں پوچھتا ہوں کچھ سمجھ میں آتا بھی ہے؟ اب میرا استعجاب اور غصہ جاتا رہا۔ اور کہا، کچھ عربی جانتا ہوں، کہیں کہیں سمجھ میں آ جاتا ہے۔ بات ختم ہو گئی کوئی چھ ماہ بعد ایک دن بیٹھ گئے اور فرمایا" بیٹا قرآن کریم اُس کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پر یہ نازل ہوتا ہے میں حیران تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن کریم کسی پر نازل ہو ہی نہیں سکتا...... فرمایا یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ قرآن کریم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کسی پر نازل ہی نہیں ہو سکتا۔ میں پھر حیران ہوا تو فرمایا "انسانیت کو جس معراج پر پہنچانا فطرت کا مقصود ہے اس کا نمونہ ہمارے سامنے محمدؐ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے" اسی پر اقبال نے فرمایا۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب   گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

اور آگے فرماتے ہیں کہ " حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک ہر نبی میں محمدؐ ہی کے مختلف مدارج تھے وہ ؛

سلسلے گویا (Muhammad in the making) تکمیل محمدؐ کے منازل تھے بنیادی اصول ہر جگہ ایک تھا۔ البتہ شعورِ انسانی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ فروعات کی تکمیل ہوتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ محمدؐ مکمل ہو گیا۔ اور باب نبوت بند ہو گیا۔ انسانیت اپنی معراجِ کبریٰ تک پہنچ گئی۔ اب ہر انسان کے سامنے معراجِ انسانیت کا نمونہ موجود ہے کوئی انسان جتنا محمدیتؐ کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اتنا ہی قرآن اس پر نازل ہو جاتا ہے یہ مفہوم تھا میرے کہنے کا کہ قرآن کریم اس کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر نازل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ اقبال تاجدار کونین کی مدح و ثنا کے ساتھ اسلامی تعلیمات کی تفسیر بھی پیش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش — تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش
در شبستانِ حرا خلوت گزید — قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشمِ او محرومِ نوم — تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم
وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز — دیدۂ او اشکبار اندر نماز
در دعائے نصرت آمین تیغِ او — قاطعِ نسلِ سلاطین تیغِ او
در جہاں آئینِ نو آغاز کرد — مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد
از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد — ہمچو او بطنِ امِ گیتی نزاد
در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
در مصافے پیشِ آں گردوں سریر — دخترِ سردارِ طے آمد اسیر
پائے در زنجیر و ہم بے پردہ بود — گردن از شرم و حیا خم کردہ بود
دخترک را چوں نبیؐ بے پردہ دید — چادرِ خود پیشِ روئے او کشید
ما ازاں خاتونِ طے عریاں تریم — پیشِ اقوامِ جہاں بے چادریم
روزِ محشر اعتبارِ ماست او — در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او
لطف و قہرِ او سراپا رحمتے — آں بیاراں ایں با عدا رحمتے
آنکہ بر اعدا درِ رحمت کشاد — مکہ را پیغامِ لا تثریب داد

جنگ و جدل اور دوسرے دنیاوی کاموں میں رسولِ اکرمؐ کا عمل مسلمانوں کے لئے نمونہ اسی لئے ہے کہ وہ قرآن کا عملی روپ ہے۔ یہی وجہ ہے سورۃ القمر میں معجزہ "شق القمر" کی طرف اس طرح اشارہ کیا گیا ہے کہ "اقتربت الساعۃ وانشق القمر (پاس آئی قیامت اور شق ہو گیا چاند) جیسے اقبالؔ نے یوں پیش کیا کہ،

پنجۂ او پنجۂ حق می شود — ماہ از انگشتِ او شق می شود

انسان کی فضیلت ہمیشہ سے اقبال کا پسندیدہ اور بنیادی موضوع رہا ہے اس کی بنیاد بھی رسول پاکؐ کی ذاتِ مبارک ہے

(بقیہ ۱۴۴ صفحہ پر)

اغلاط نامہ

صفحہ نمبر	سطر	غلط	صحیح
۶	۴	عمرکو	عمرکوئی
۷	۷	انجام دیں	انجام دی
۷	۹	بدعاہو	بدعاہوں
۷	۱۳	پر ی	پرمیری
۸	۱۲	مسمی	محبّی
۹	۴	زر	زرق برق
۹	۱۲	سرزمین	سرزمین میں
۹	۱۴	کی سیی یہ	کی مسیحا آثار
۱۰	آخری	غیض	غیظ
۱۱	۶	رشوتوں	رشتوں
۱۲	۲	رو پری	کے رویوں
۱۲	۳	ہرم	ہردم
۱۲	۸	آرہا ہے	آرہا تھا
۱۲	۲۰	پرمغز مقابلوں	پرمغز مقالوں
۱۲	۲۲	غزل کی	منزل کی
۱۳	۱	یونیورسٹی	زرعی یونیورسٹی
۱۳	۴	مقا	مقالہ
۱۳	۵	لیت	شمولیت
۱۳	۷	دارہ	دائرہ
۱۳	۹	ہوائی	ہوئی
۱۳	۱۰	آل اطر آنس	آل اظہر
۱۳	۱۲	ہوں	ہوئی
۱۳	۱۴	قومی شاعری	ملّی شاعری
۱۳	۱۴	دشوار	دُرّشہوار
۱۳	آخری	ہوئی	ہوا
۱۴	۸	کرو	کروں
۱۸	۱۶	سے نہیں	سے پیچھے نہیں
۱۸	۱۶	جشن سیمین	جشن سیمین نمبر
۲۲	۱۲	علماء کو	علماء کی
۲۳	۲۲	حد درجہ سست	حد درجہ سلاست
۲۹	۱	نام	تا
۲۹	۳	ہے اندر	اپنے اندر
۳۱	۵	وجود نہیں	وجود میں
۳۲	۲۴	شاہی پرستی	شاہی سرپرستی
۳۴	۱۷	اخلاقی پہلووں	اختلافی پہلووں
۳۶	۱۰	مذہبی اور	مذہب اور
۴۴	۷	نظریہ	اس نظریہ
۴۴	۲۱	ادبیت	ادیب
۴۵	۱۵	دھیاپڑ	دھیاپڑگیا
۴۶	۱۴	طاقت الہی	طاعت الہی
۴۶	۱۵	مخالفت	مخالف
۴۷	۴	بن گئی	بن جائے
۴۷	۸	کو	؟
۴۷	۱۷	کردیتا ہے	کردینا
۴۷	آخری	قنوتیّت	قنوطیّت
۴۸	۸	کرتی ہے	کرتا ہے
۴۸	۱۱	حرا	خدا
۴۸	۲۴	مہم	مبہم

صفحہ نمبر	سطر	غلط	صحیح
٤٩	١١	جس گھٹن کچھ غربت	جنسی گھٹن کچھ غریب
٤٩	١٥	کیوں اسے	اس لئے کہ
٥٠	٥	نیچے	پنجے
٥١	١٢	مفہوم کے	مفہوم کہ
٥٧	٩	فریب ایسے	قریب اپنے
٥٧	١١	ان کی	ان کے
٥٧	١٤	علم وعدل	علم و عمل
٥٩	١٤	جانثاری	جاں نثاری
	١٤	کرد	کروں
٦٢	٢	شاعر اسلام	شعائر اسلام
٦٢	٢٠	کہاں کہاں پھرائے گی	کہاں کہاں لئے جائیگی
٦٣	٨	دونوں کا	دونوں کو
٦٣	١٥	معرفین	معترضین
٦٤	٦	سیارتھ	ستیارتھ
"	٧	تیشہ	دشنے
"	١٢	دین لین	دین متین
٦٥	٦	ہی نہیں تھی	ہی میں نہ تھے
"	١٦	حاصل	معمول
"	١٩	سدا	صدا
٦٨	٢	پر لٹکایا	پر سولی پر لٹکایا
٦٩	٨	تہاشا	تحاشا
٧٠	١	روح پروری	روح پرور
٧١	١٤	کہلاتی رہے	کہلاتی رہی

صفحہ نمبر	سطر	غلط	صحیح
٧١	١٤	مہدی اسے کہلائی	مہند کہلائی
٧٢	١٣	عامر آدم	باوا آدم
"	١٨	نحی	یحیٰ
"	٢٠	عبدالحق صاحب کے	عبدالحق صاحب کی
"	٢١	نقاط	نکات
٧٣	٣	عبدالحق مجدد	عبدالحق محدث
٧٣	١٥	شاہ عبدالعزیز	شاہ رفیع الدین
٧٣	١٧	مولانا ابوالعالی	مولانا ابوالاعلی
٧٤	٢	راستے اردو	راستے میں
٧٦	٣	دلوں کے	دلوں کی
٧٧	٧	گلشن بے خار	گلشن بے خار تک
٨١	عنوان	ڈاکٹر سید احمد	ڈاکٹر سید عبداللہ پروفیسر ایم لطیس
٨١	٩	انقلاب کا	انقلاب اس کا
٨١	١١	١٩٣٥-٣٦	١٩٣٥-٣٦ء
٨١	١٣	اعزاض ومقاصد	اغراض و مقاصد تفصیل
٩٤	١١	جگر ہی	جگر جان
٩٤	١٢	صحری	صحرائی
٩٤	١٢	صحرائی ہو	صہبائی
٩٤	١٩	مسلمان کا	ہر مسلمان کا
٩٤	٢١	مسجد میں	مسجدیں
٩٥	٧	غنیم یوں	یوں غنیم
١٠٣	١٧	نعت ومحامہ	نعت ومحامد
١٠٥	١	تبع کے	تبع نے

صفحہ نمبر	سطر	غلط	صحیح
۱۰۵	۴	اہل یثرت	اہل یثرب
۱۰۵	۱۰	عربی لغب	عربی لغت
۱۰۶	۹	مخاطب	خطاب
۱۰۶	۱۷	عرب ہی	عرب میں
۱۰۷	۸	گلہائے	کے لئے گلہائے
۱۰۸	۴	آس پر	آس ہر
۱۰۹	۱۰	پیروی میں ہوں	پیروی میں
۱۱۰	۳	آہ آہ	آہ آہ کا
۱۱۴	۱۳	ہاتھ میں لئے	ہاتھ میں ہو ہی
۱۱۵	۱۲	قبیس	بوقبیس
۱۱۵	۲۳	حرا میں	حرا سے
۱۱۸	۱۰	عشق میں	عشق
۱۲۱	۱۱	لے کے دم	لے کے
۱۲۱	۲۲	اک تیمہ اور	اک تتمہ اور
۱۲۲	۱۷	جہاں نوازی	جاں نوازی
۱۲۶	۹	کسب داطاعت	کسب وقناعت
۱۲۷	آخری	طرز	طراز
۱۳۰	۷	پہچاں سے	پہچان ہے
۱۳۰	۱۹	افسوس ہم	افسوس کہ ہم
۱۳۱	۷	کان وحیدوق	کان وصدوق
۱۳۱	۱۰	کریم وغیر	کریم ومیر
۱۳۳	۸	بدلنے	برسنے
۱۳۸	۱	الولعزم	اوالعزم
۱۳۸	۷	مداح	مدح
۱۳۸	۱۶	صحابہ مظام	صحابہ عظام
۱۳۹	۱۴	ہے علم بھی وہی ترا	ہے عمل بھی وہی ترا
۱۳۹	۱۵	مدوا	مداوا
۱۳۹	۱۶	کمال سومو	کمال کے سرمو
۱۳۹	۱۶	ترا تیر	ترا تیر
۱۳۹	۱۷	کاجہاں	کار جہاں
۱۳۹	۱۷	کام زمانے	کام زمانے
۱۴۰	۱	مثنوی	مثنوی کی
۱۴۰	۲۳	گرم نحن	گرم سخن
۱۴۰	۲۴	غضب شدہ آفاق	غضب شہرۂ آفاق
۱۴۱	۱۷	نقش قد	نقش قدم
۱۴۲	۱۸	رتبہ کہ ہے	رتبہ کہ رہے
۱۴۳	۱۸	ابدالنشت فلک...الخ	تاابدلپشت فلک
۱۴۲	۶	اس شر کا	اس شاہکار
۱۴۲	۹	معرکۃ الدوا	معرکۃ الآرا
۱۴۲	۱۲	مدحت پیر	مدحت پیمبر
۱۴۲	۲۴	ہدیہ عقیدت کا	عقیدت کا
۱۴۲	۲۵	دل بیداری	دل بیدار
۱۴۳	۱	نہ کرسکی	نہ کرسکا
۱۴۳	۲	بخشا	بخشی
۱۴۴	۲	عطا کرے	عطا کر
۱۴۳	۱۵	منقبتس	منقبتیں

صفحہ نمبر	سطر	غلط	صحیح
۱۴۳	۱۰	پروان چڑھتی ہے	پروان چڑھا
۱۴۳	۲۳	علی دنفیس مصطفیٰ	علی ونفس مصطفیٰ
۱۴۳	۲۳	ہنر بر	ہنر بر
۱۴۳	۲۵	رودشن روسن	رودش رودش
۱۴۴	۴	وحی	وصی
۱۴۵	۷	اردو شاعری مرثیہ نگاری	(حذف کردیجئے)
۱۴۶	۱۴	دکھنی مرثیہ	دکنی مرثیہ گو
۱۴۶	۱۱۸	سودانے بھی مرثیہ	سودانے بھی مرثیے
۱۴۶	۲۰	سہنے	کہنے
۱۴۶	۲۳	میر ضما	میر ضمیر
۱۴۶	۲۳	تربیت	ترتیب
۱۴۶	۲۵	مرثیہ	مرثیے
۱۴۶	۲۵	واردات قلی	واردات قلبی
۱۴۷	۱۳	جزبات	جزئیات
۱۴۷	۱۹	جدم وتیر	جبدم دوتیر
۱۴۷	۲۵	زیادہ نہیں	زیادہ ہیں
۱۴۸	۱	مناطی	صناعی
۱۴۸	۴	مرزالعشن	مرزالعشق

صفحہ نمبر	سطر	غلط	صحیح
۱۴۸	۱۱	مرثیہ گوہوں	مرثیہ گویوں
۱۴۸	۱۶	سویاد	سویادہ
۱۴۹	۳	پیش پیش	پیش
۱۵۰	۱۹	شہر شرب	شہہ
۱۵۱	۵	شفیع المذنب	شفیع المذنبین
۱۵۱	۲۲	اس کو	اس کو ہی
۱۵۲	۳	بس یہی	بس یہی
۱۵۲	۱۰	اسپین میں ترا گاڑھا	اسپین میں ترا گاڑا
۱۵۲	۲۳	آتے نظر مجھ	آئے نظر جو مجھ
۱۵۳	۱۱	ظل سبحانی	ظل سبحان
۱۵۳	۱۴	اور زیادہ و	اور زبان وادب
۱۵۵	۱	اسی	اسے
۱۵۵	۸	قرآن میں آپ	قرآن مبین آپ
۱۵۵	۹	رنار سے ہدم	مختار سے ہمدم
۱۵۶	۱۶	رحمت اللعلمین	رحمۃ للعالمین
"	۱۷	"	"
"	۱۸	"	"